شریعت کسے کہتے ہیں؟

قرآن کا اسلوبِ ہدایت یہ ہے کہ اس نے (بجز چند مستثنیات) اسلامی نظام کے لئے صرف اصول متعین کئے ہیں ان کی جزئیات متعین نہیں کیں۔ اس لئے اس کے اصول محکم اساس پر مبنی ہیں جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ لیکن ان اصولوں کی جزئیات مختلف حالات کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ ان بدلنے والی جزئیات کو عام اصطلاح میں شریعت کہا جاتا ہے۔ شریعت کسی جامد یا غیر متبدل مجموعۂ قوانین کا نام نہیں بلکہ ہر وہ مجموعۂ قوانین (یعنی قرآنی اصولوں کے تابع مدوّن کردہ جزئیات) جو کسی ایک زمانے کی قرآنی حکومت اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق مدوّن کی تھیں۔ یعنی سابقہ دَور کی شریعت، بعد کے دَور کی اسلامی حکومت کے لئے بطور نظائر (PRECEDENTS) کام دے گی۔ قرآن کے ابدی اصولوں کی روشنی میں سب سے پہلی حکومت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کی اور آپؐ کے بعد آپؐ کے خلفائے حقہؓ نے اس اسلامی حکومت نے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قرآنی اصولوں کی جزئیات خود متعین کیں۔ اگر یہ سلسلۂ خلافت اسی طرح قائم رہتا تو ہر دَور کے تقاضوں کے مطابق تدوینِ شریعت کا یہ سلسلہ قائم رہتا، لیکن وہ دَور جلد ختم ہوگیا اور اس کے بعد مسلمانوں میں ملوکیت آگئی۔ جس میں رفتہ رفتہ امورِ دنیاوی کو حکومت نے اپنے ذمہ لے لیا اور "مذہبی امور" کو اربابِ مذہب کے سپرد کر دیا۔ ان حکومتوں نے بھی اپنی ضروریات کے لئے قوانین مرتب کرائے اور یہ قوانین اس وقت کے لئے شریعتِ اسلامی قرار پائے۔ لیکن دین کو دنیا سے الگ کر دینے سے نظامِ اسلامی کی اصل میں خرابی آگئی اور ایسے قوانین بھی مرتب ہونے شروع ہوگئے جو قرآن کی واضح تعلیم کے خلاف تھے۔ اب مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ جہاں جہاں ان کی اپنی حکومتیں ہیں وہ امورِ سلطنت سے متعلق اپنی منشاء کے مطابق قوانین مرتب کرتی ہیں لیکن "امورِ مذہب" سے متعلق (جسے PERSONAL LAWS کہا جاتا ہے) مفتیوں سے فتوے لے لئے جاتے ہیں۔ اور جہاں ان کی اپنی حکومت نہیں، وہاں یہی فتویٰ انفرادی طور پر صادر ہوتے رہتے ہیں۔ اگر آج ہم چاہتے ہیں کہ پاکستان میں قرآنی منشاء کے مطابق شریعت کا نفاذ ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہم قرآنی اصولوں کی روشنی میں اپنے دَور کے تقاضوں کے مطابق اپنے قوانین خود متعین کریں۔ یہی قوانین شریعتِ اسلامی کہلائیں گے نہ کہ وہ قوانین جو اپنے زمانے کے حالات کے مطابق کسی سابقہ اسلامی حکومت نے وضع کئے تھے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

لمعات

شریعت بل ۔ نیا دام

ہوائیں معمول کے مطابق چل رہی ہوں تو ان کا رخ متعین ہوتا ہے اور جس شخص کو موسمی تغیرات کا تھوڑا بہت علم یا تجربہ ہوتا ہے وہ قیاساً بتا سکتا ہے کہ اس کے بعد فلاں ہوا کا رُخ کس سمت کو ہوگا لیکن جب جھکڑ چل رہے ہوں تو کسی ہوا کا رُخ چونکہ متعین ہی نہیں ہوتا اس لئے یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس کے بعد ہواؤں کا رُخ کس کس سمت کو ہوگا۔ پاکستانی سیاست میں جو جھکڑ اس وقت چل رہا ہے ۔ اس کی مثال گزشتہ چالیس برس میں نہیں ملتی ۔ سیاسی مہرہ بازیوں کے اس جھکڑ میں قومی سینیٹ نے شریعت بل منظور کر کے قوم کو ایک نئی الجھن میں ڈال دیا ہے ۔ اور خطرہ ہے کہ پرسکون ماحول میں بحث و تمحیص کا متقاضی یہ اہم ترین مسئلہ بھی سیاسی سودے بازی کا شکار نہ ہو جائے۔

شریعت بل میں اگرچہ کوئی ایسی بات نہیں جو پہلی بار کہی گئی ہو لیکن بادی النظر میں جو بات اس کے خلاف عوامی ردِ عمل کا باعث بنی ہے اور جس پر خواتین کو پریشانی لاحق ہوئی ہے وہ بل کے ساتھ لفظ شریعت کا لاحقہ ہے ۔ شریعت سے مراد عامۃ النّاس کے نزدیک وہ فقہی قوانین ہیں جو مسلمانوں کے دورِ حکومت میں مقامی حالات اور وقتی ضروریات کے تحت وضع ہوئے اور مرورِ زمانہ کے ساتھ انہیں اسلامی ہونے کا تقدّس حاصل ہوگیا ۔ عوام کا یہ خدشہ چنداں غلط بھی نہیں کیونکہ یہ قوانین مختلف فرقوں کی فقہوں میں بدستور موجود ہیں اور شریعت بل کا مقصد بھی قانون سازی کے آئینی طریق کو روک کر انہی قوانین کو دوام بخشنا ہے ۔ دستور میں شامل قرار دادِ مقاصد کے مطابق یہ طے کیا گیا تھا کہ :-

> "مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات و مقتضیات کے مطابق جس طرح قرآنِ پاک اور سنّت میں ان کا تعین کیا گیا ہے ترتیب دے سکیں"۔ (دستورِ پاکستان بشق ۲۔ الف)

مقصود چونکہ قرآن اور سنّت کا اتّباع ہے لہٰذا لفظ شریعت کی جگہ "قرآن و سنّت" کی اصطلاح استعمال کی جاتی تو عوام کے ذہنوں میں بدگمانی کا احتمال شاید کم ہوتا

قانون کے نفاذ سے پہلے کسی بھی مہذّب معاشرے میں یہ ضروری ہوتا ہے کہ ——— وہ قوانین ایک ضابطے کی شکل میں منضبط ہوں۔ چنانچہ دستور کی شق ۲۲۷ میں طے کیا گیا تھا کہ موجودہ قوانین کو قرآن اور سنّت میں منضبط اسلامی احکام کے مطابق بنایا جائے گا۔ اس مقصد کے لئے اسلامی نظریاتی کونسل تشکیل دی گئی جو اب تک کچھ کام کر بھی چکی ہے۔ علاوہ ازیں کسی قانون کے خلافِ شریعت ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ دینے کے لئے ملک میں وفاقی شرعی عدالت موجود ہے جس کے دروازے ہر خاص و عام کے لئے بلا کورٹ فیس کھلے ہیں۔ جب کہ اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالتوں کے فیصلوں کے مطابق قانون سازی کے لئے قانون ساز ادارے ہر دور میں موجود رہے ہیں۔ رہے شخصی قوانین تو ان کے لئے شریعت ایکٹ پہلے سے موجود ہے جس کے خلاف نہ مذہبی پیشوائیت نے کوئی جلوس نکالا ہے نہ ہماری خواتین سڑکوں پر آئی ہیں۔

تصریحاتِ بالا سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ مملکتِ پاکستان میں از رُوئے دستور یہ طے ہے کہ قوم کی منزل اتباعِ قرآن و سنّت ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے نظام کار بھی موجود ہے۔ اس نظام کی وساطت سے پبلک لاز کا کوئی متفق علیہ ضابطہ اگرچہ سامنے نہیں آیا لیکن سفر بہرحال جاری ہے۔

چاہیئے تو یہ تھا کہ آئین میں موجود ان موانعات کا لوٹس لیا جاتا جن کی وجہ سے طے شدہ اصولوں کے مطابق نفاذِ شریعت کا عمل سُست روی کا شکار ہے یا آئین کی اُن دفعات کو ختم کرنے کی مہم چلائی جاتی جن کی بدولت اربابِ حکومت نہ صرف احتساب سے ماوراء ہیں بلکہ وہ اللہ کی طرف سے عطا کردہ بنیادی حقوق تک جب چاہیں معطّل کر سکتے ہیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا کرنے کی بجائے کوشش یہ کی گئی ہے کہ قرآن و سنّت کی حکمرانی کے دستوری فیصلے کو جس پر پہلے سے کام ہو رہا تھا ——— شریعت کا نام دے کر قانون سازی کے نظام میں علمائے فِقہ کو شامل کر کے قومی سطح پر مشاورت کے عمل کو یکسر مفلوج کر دیا گیا ہے جس سے ملک میں موجود مختلف فرقوں کے مابین فقہی اختلافات کی بنیاد پر کسی وقت بھی انتشار کا خدشہ ہو سکتا ہے۔ شریعت بل کو ابھی تک قومی اسمبلی میں زیرِ بحث نہیں آیا لیکن علمائے فقہ یہ کہہ کر اس کی حمایت میں رائے عامہ ہموار کر رہے ہیں کہ دیکھئے پاکستان میں پہلی آئین ساز اسمبلی سے لے کر آج

تک کسی نے قرار دادِ مقاصد سے انکار نہیں کیا۔ قرآن و سنّت کی حکمرانی چونکہ ایک طے شدہ مسئلہ ہے۔ لہٰذا شریعت بل کی مخالفت کرنے والا مسلمان نہیں ہو سکتا۔ نظر آتا ہے کہ قرآن و سنّت کی حکمرانی اور شریعت بل کو ویسے ہی لازم و ملزوم بنا لیا گیا ہے جس طرح پچھلے دنوں ریفرنڈم میں نفاذِ اسلام اور جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کو لازم و ملزوم قرار دے کر ان کی حکمرانی کو دوام بخشنے کی کوشش کی گئی تھی حالانکہ یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ قرآن و سنّت کی حکمرانی سے نہ کسی کو پہلے انکار تھا نہ اب ہے اور نہ کبھی ہو سکتا ہے لیکن سینیٹ کا منظور کردہ شریعت بل نہ تو صحیفۂ آسمانی ہے کہ اس پر تبصرہ کفر ہے اور نہ ہی نفاذِ اسلام کے اس طریق کار سے اتفاق ممکن ہے جس سے قوم، پارٹیوں اور فرقوں میں تقسیم ہو کر اتحادِ ملّت کا سبق ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بھول جائے۔

شریعت بل کا مکمل متن اسی پرچہ میں شاملِ اشاعت ہے۔ تاہم قارئین کے استفادہ کے لئے چیدہ چیدہ دفعات درج ذیل ہیں

(۱) عدالتیں اس بل کے نفاذ کے بعد تمام فیصلے قرآن، سنّت، اجماع اور قیاس کی بنیاد پر کریں گی۔

(۲) قرآن، سنّت اور اجماع اور قیاس کی تعبیر کے لئے علماءِ فقہ کو عدالتوں میں معاون جج مقرر کیا جائے گا۔ (ہر عدالت میں ہر فرقے کے لئے ایک معاون! گویا ہر عدالت میں ایک جج اور جتنے فرقے اتنے معاون جج۔)

(۳) ان عدالتوں کے سامنے اگر کوئی ایسا سوال آئے کہ کوئی قانون، قرآن، سنّت، اجماع اور قیاس کے خلاف ہے تو حتمی فیصلہ وفاقی شرعی عدالت یا عدالتِ عالیہ کرے گی۔

(۴) وفاقی شرعی عدالت میں مذہبی علماء کو بطور مفتی مقرر کیا جائے گا۔ (ہر بینچ میں غالباً ہر فرقے کا ایک ایک مفتی)

(۵) دستور میں قرآن اور سنّت کے الفاظ تھے۔ شریعت بل میں "اجماع" اور "قیاس" کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ (روزنامہ جنگ)

اس بل کے نفاذ کے بعد عدالت کے سامنے نہ تو موجودہ ضابطۂ قوانین ہوگا اور نہ ہی سنّت، اجماع اور قیاس پر مبنی کوئی ایسی کتاب جو سب مسلمانوں کے نزدیک قابلِ قبول ہو۔ عدالت کے کرنے کا کام صرف یہ ہوگا کہ وہ مقدمہ زیرِ سماعت کا فیصلہ کرنے کے لئے اپنے معاون جج (مولوی صاحب) کی مدد سے چودہ سو سال پر محیط اسلامی کتب سے کوئی نظیر تلاش کرے اور ملزم پر چسپاں کر دے۔ مقصد اگر یہی ہے تو قارئین کے علم میں ہوگا کہ کمپیوٹر یہ خدمات کہیں بہتر طریق سے سرانجام دے

سکتا ہے۔ ہزاروں معاون ججوں اور مفتیوں کی جگہ پورے ملک اور سبھی فرقوں کے لئے کمپیوٹر کا ایک پروگرام کافی ہو گا جس میں نہ غلطی کا احتمال ہو گا نہ کوتاہ بینی کا خدشہ۔ رہے عوام، تو کسی منضبط قانون کی عدم موجودگی میں (جیسا کہ اب کیا جا رہا ہے) ان بے چاروں کو تو علم ہی نہیں ہو گا کہ ملک میں کونسا قانون نافذ ہے۔ جس کی مرضی دائیں چلے، جس کا جی چاہے بائیں ہو لے، کوئی درمیان میں چلنا چاہے تو بھی مضائقہ نہیں۔ کیونکہ قرآن اور سنّت کی رُو سے بقول مولانا مودودی صاحب یہ ممکن ہی نہیں کہ ملّت کے لئے کوئی ایسا پبلک لاء بن سکے جو تمام فرقوں کے نزدیک قابلِ قبول ہو (بحوالہ ایشیاء ۲۳، اگست ۱۹۷۰ء) ——— شریعت بل عرصہ پانچ سال تک زیرِ بحث رہا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ علماء حضرات اس دوران قرآن و سنّت پر مبنی پبلک لاز کا کم از کم کوئی مُسَنّیٰ ضابطہ ہی مرتب کر لیتے جو سب فرقوں کے نزدیک قابلِ قبول ہوتا۔ لیکن پانچ سال کے غور و خوض کے بعد وہ بھی اسی نتیجہ پر پہنچے کہ قرآن و سنّت کی رُو سے کوئی متفق علیہ ضابطۂ قوانین مرتب کرنا ممکن نہیں تو نہ سہی، ضابطۂ قوانین کی آخر ضرورت ہی کیا ہے۔ ہر عدالت میں ایک فہرست نگار بٹھا دیجئے جو دورانِ سماعت اسلامی کتب دیکھ کر بتا دے کہ ملزم سے کیا جرم سرزد ہوا ہے اور وہ اپنے عقیدے کی رُو سے کس سزا کا مستوجب ہے۔ لیجئے! ———

——— چالیس برس سے اُلجھی ہوئی گتھی بھی سُلجھ گئی اور علماء حضرات کی روزی کا بندوبست بھی ہو گیا!

اسے کہتے ہیں "ایک پنتھ دو کاج"

حضرت علامہ اقبالؒ نے جب پاکستان کا تصوّر پیش کیا تو وہ ان تمام مشکلات سے واقف تھے جو اس سلسلہ میں پیش آسکتی تھیں اور اس کا حل بھی انہوں نے اسی زمانے میں تجویز کر دیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں میں ہر فرقہ کی فقہ الگ الگ ہے، احادیث کے مجموعے الگ الگ ہیں اور سنّت کا تصوّر الگ الگ ہے۔ لیکن اس کے باوجود اسلام میں ایک ایسی چیز موجود ہے جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہے اور وہ ہے خدا کی کتاب "قرآن مجید"۔ ——— اسلامی مملکت کے لئے قانون سازی کا اصول یہ ہونا چاہیئے کہ قرآنِ مجید کے اصول و قوانین اور حدود کو غیر متبدّل رکھا جائے۔ ہماری فقہ اور احادیث میں جو کچھ قانون کی حیثیت سے آیا ہے، قرآن کی روشنی میں اس کا جائزہ لیا جائے، جو قوانین اس کے خلاف نہ ہوں اور زمانے کے تقاضوں کو پورا کر سکیں، انہیں اختیار کر لیا جائے اور باقی امور کے لئے قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے مملکت خود قوانین وضع کرے۔ قرآن کی حدود ہمیشہ کے لئے غیر متبدّل رہیں گی اور اس کی روشنی میں

مرتب کردہ قوانین زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلے جا سکیں گے۔ ثبات و تغیر کے اس امتزاج سے اسلام قیامت تک نظامِ مملکت بن سکنے کے قابل ہے۔

طلوعِ اسلام روزِ اوّل سے اس نظریئے کا داعی ہے اور اس کا ایمان ہے کہ:

یہی چراغ جلے گا تو روشنی ہوگی!

نظریۂ پاکستان کی رُو سے دیکھئے تو تقسیمِ ہند کی وجۂ جواز یہ تھی کہ ہم ایک ایسی مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں اسلامی قوانین کا نفاذ ہو سکے۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ اسلامی قوانین کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب ہی نہیں ہو سکتا جسے پبلک لاز کی حیثیت سے مُلک میں نافذ کیا جا سکے تو اس سے تو ہماری اس جُداگانہ مملکت کی وجۂ جواز ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد یہاں یہ سوال اُبھرے گا کہ کیوں نہ اس مملکت کو دنیا کی دوسری مملکتوں کی طرح سیکولر سٹیٹ بنا دیا جائے۔ یہی وہ نظام ہے جسے ہندوستان میں ہندو قائم کرنا چاہتا تھا اور مخالفینِ شریعت بل کے اساتذہ سمیت ہمارے علماء کی اکثریت بھی اسی نظام کی داعی تھی۔ لیکن انہیں وہاں شکست ہوئی اور پاکستان معرضِ وجود میں آگیا۔ وہی علماء اب پاکستان میں سیکولر نظام کے لئے کوشاں ہیں جس میں مذہبی دائرے میں حکمرانی مذہبی پیشواؤں کی تسلیم کر لی جاتی ہے اور دنیاوی معاملات میں اقتدار سیاست دانوں کے پاس رہتا ہے۔ اس کے لئے جو طریقِ کار اختیار کیا جا رہا ہے وہ وہی ہے کہ دین کو روایات کی آمیزش سے اس طرح ناقابلِ عمل بنا دو کہ تنگ آکر عوام خود ہی سیکولرازم پر راضی ہو جائیں۔ اس نظام میں مذہبی پیشوائیت اور سیاست دانوں کے جملہ حقوق چونکہ یکساں محفوظ ہوتے ہیں، اس لئے ایسے نظام کو عوام پر مسلّط کرنے میں چنداں دقّت پیش نہیں آتی۔

شریعت بل اسی نوع کی ایک کوشش ہے جس کی کامیابی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ قومی اسمبلی اسے سنجیدگی سے لیتی ہے یا کارِ ثواب سمجھ کر اس پر مہرِ تصدیق ثبت کر دیتی ہے۔

۲۔ برائے توجّہ حکومتِ پاکستان!

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے!

اخباری اطلاعات کے مطابق یکم جولائی ۱۹۹۰ء سے حکومتِ پنجاب نے اپنے ملازمین کی پنشن میں دس فیصد اور مرکزی حکومت نے ۵ فیصد کا اضافہ کر دیا ہے۔ یہ تو ہمیں معلوم نہیں کہ حکومت

کے اس اقدام سے سرکاری خزانہ پر کس قدر بوجھ پڑے گا لیکن اس میں شبہ نہیں کہ غریب پنشنروں کی حالتِ زار پر اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ کیونکہ پنشنروں کی دو تہائی تعداد جس میں ہمارے جانباز فوجی بھی شامل ہیں ۴۰۰ روپے سے بھی کم پنشن پا رہی ہے ان کی پنشن میں زیادہ سے زیادہ بیس روپے کا اضافہ ہوگا جو دال روٹی تو ایک طرف ان کے بڑھاپے کی اہم ضرورت دوا کے بڑھتے ہوئے اخراجات کے لئے بھی کافی نہ ہوگا۔

ذرا تصور میں لائیے اس منظر کو کہ ایک شخص پچیس تیس سال کی مسلسل محنت کے بعد، ملازمت کے آخری زینہ تک جا پہنچا ہے، اس کا اور اس کے متعلقین کا معیارِ زیست اس نسبت سے بلند ہو چکا ہے۔ زندگی کی آسائشیں میسر ہیں۔ رہنے کو سرکاری مکان (بعض اوقات بلا کرایہ اور دیگر حالات میں محض برائے نام کرایہ پر) موجود ہے۔ اس کی دیکھ بھال کے لئے سرکاری انتظامات ہیں۔ طبی امداد مفت حاصل ہے کہ اس کی ریٹائرمنٹ کا حکمنامہ موصول ہو جاتا ہے جو اس کی حسنِ کارکردگی کی سند ہوتا ہے لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اس سے وہ ساری آسائشیں چھن جاتی ہیں۔ مکان سے باہر نکال دیا جاتا ہے۔ الاؤنسز وغیرہ ختم ہو جاتے ہیں اور سب سے بڑی چیز یہ کہ تنخواہ بھی نصف (اور بعض حالات میں اس سے بھی کم) رہ جاتی ہے۔ آپ سوچئے کہ عین اس وقت جب اُسے (عمر کے آخری حصہ میں) زیادہ آسائشوں کی ضرورت تھی اس کا اس طرح "کھجور سے نیچے آگرنا" کس قدر استخواں شکنی کا موجب ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے اس کی اس حالت کا نقشہ بڑے عبرت انگیز انداز سے کھینچا ہے۔ جب فرمایا کہ:

اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَ اَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۪ فَاَصَابَهَا اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ (۲/۲۶۶)

(ذرا سوچو کہ) ایک شخص ہے جس کے پاس کھجوروں اور انگوروں پر مشتمل (لہلہاتا) باغ ہے۔ اس میں (سیرابی و شادابی کے لئے) نہریں بہہ رہی ہیں۔ اس میں ہر قسم کے پھل پھول پیدا ہوتے ہیں۔ وہ بوڑھا ہو جاتا ہے اور چھوٹی چھوٹی اولاد اس کے گرد جمع ہوتی ہے کہ اتنے میں ایک جھلستی ہوئی آندھی چلتی ہے اور آن کی آن میں وہ باغ جل کر ویران ہو جاتا ہے

کیا تم میں سے کوئی بھی چاہے گا کہ اس کا یہ حشر ہو جائے

اللہ ایسی ہی مثالوں کے پیرایہ میں تم پر حقیقت کی نشانیاں واضح کر دیتا ہے تاکہ تم غور و فکر سے کام لو!

ایسا کون چاہے گا؟ لیکن وہ چاہے یا نہ چاہے، پنشنر کو یہ باغ چھوڑ کر اپنے اپنے بال بچوں کے ساتھ ویرانے میں بسنا پڑتا ہے۔ پھر طرفہ تماشا یہ کہ جب اسے پنشن ملی تھی تو اس وقت روپے کا بیس سیر آٹا ملتا تھا۔ اب تین روپے سیر ملتا ہے۔ بڑھاپا بڑھتا جاتا ہے۔ قویٰ کمزور ہوتے جاتے ہیں۔ آسائشوں کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے اور اس کی آمدنی (ہوشربا گرانی کی وجہ سے) دن بدن سکڑتی جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی پنشن والوں کی تو فاقوں تک نوبت آجاتی ہے۔ اور یہی وہ طبقہ ہے جو فوری توجہ کا محتاج ہے۔ ان بے چاروں کی عام طور پر حالت کیا ہوتی ہے اس کی ایک جھلک دیکھنی ہو تو کسی مہینے کی پہلی تاریخ کو خزانے کے دفتر کے سامنے جائیے اور دیکھئے کہ یہ سسکتی ہڈیاں آپ کو کیا کیا یاد دلاتی ہیں۔

اس صورتِ حال کی بنیادی ذمہ دار وہ ذہنیت ہے جس کے مطابق انگریز نے سرکاری ملازمین کی تنخواہ ان کی ضروریات کے مطابق نہیں، بلکہ اپنے پیمانوں کے مطابق مقرر کی۔ اس تنخواہ میں کسی کا گزارہ ہوتا ہے یا نہیں، اس سے اس کا کچھ واسطہ نہیں تھا۔ اور جب ملازمت کے دوران اس سے اس کا کچھ واسطہ نہیں تھا تو ملازمت سے سبکدوش ہو جانے کے بعد (پنشنر کے لئے) وہ اس سے واسطہ کیوں رکھتا؟ اس کا حقیقی حل وہی ہے جو قرآن کریم نے تجویز کیا ہے۔ یعنی یہ نظامِ معاشرہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر فرد کو اس کی ضمانت دے کہ:-

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ (۶/۱۵۲)

ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی

لیکن جب تک یہ نہیں ہوتا۔ ہم اربابِ حکومت سے پرزور گذارش کریں گے کہ وہ اس بظاہر سفید پوش لیکن درحقیقت عریاں بدن طبقہ کی حالت بہتر بنانے کے لئے بلا تاخیر ضروری اقدامات کریں تاکہ یہ ناسازگار حالات کے ستائے ہوئے، اپنی زندگی کے آخری دن قدرے پُرسکون گزار سکیں۔

پنشن کی رقم چونکہ حاضر ملازمین کی تنخواہ کے نصف سے بھی کم ہوتی ہے اس لئے ضروری ہے کہ پنشنوں میں اضافہ کرتے وقت اضافے کی شرح حاضر ملازمین سے کم از کم دوگنا رکھی جائے

تاکہ ان غریبوں کے دکھوں کا مداوا نہیں تو کم از کم اشک شوئی تو ہو سکے۔

اسے بھی پڑھ لیجئے!

قرآن ایک مستقل شریعت ہے۔ تاکہ ہر زمانے کے فرمانبرداروں اور نافرمانوں کا امتحان ہو جایا کرے۔ البتہ توحید سب زمانوں میں یکساں رہی اور معنی اس جملہ کے یہ ہیں کہ اے امتِ محمدؐ تم میں سے ہر شخص کیلئے ہم نے اس کتاب، قرآنِ کریم کو شریعت اور طریقہ بنایا ہے۔ تم سب کو اس کی اقتدا اور تابعداری کرنی چاہیئے۔ پس بہترین مقاصد حاصل کرنے کا ذریعہ اور طریقہ صرف قرآنِ کریم ہی ہے۔ اور بس!

(پارہ ۶۔ ۵ : ۴۸)
تفسیرِ ابنِ کثیر (ترجمہ:۔ مولوی محمد جوناگڑھی)
(نورُ محمد کارخانہ تجارتِ کتب آرام باغ۔ کراچی)

(کاش تفسیرِ ابنِ کثیر کے شیدائی ہمارے علمائے کرام اس تفسیر کی مذکورہ بالا عبارت کو بھی امت کے سامنے پیش کرتے)

حج

مذہب کے متعلق عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ وہ ایک فرد کی ذاتی اصلاح کا ذریعہ ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ افراد کی ذاتی اصلاح نہایت ضروری ہے۔ لیکن یہ اصلاح اصل مقصد نہیں۔ عمدہ گھڑی کے ہر پرزہ کے لئے مضبوط اور درست ہونا ضروری ہے۔ لیکن اگر یہ پرزے الگ تھلگ پڑے ہوں تو ان کی پائیداری اور مضبوطی کسی کام کی نہیں۔ یہی پرزے جب ایک نظام کے ماتحت، ایک خاص ترتیب سے، ایک جگہ جمع کر دیئے جائیں تو ان میں سے ہر پرزہ کی حرکت، دوسرے پرزوں پر اثر انداز ہوگی اور اس طرح ان کی اس مجموعی حرکت کا جیتا جاگتا نتیجہ، محسوس شکل میں گھڑی کے ڈائل پر نمودار ہو جائے گا۔ اسلام افراد کی اصلاح سے ایک ایسی جماعت تیار کرنا چاہتا ہے جو نظامِ انسانیت کو عدل پر چلا سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اس نے ایک ایسا عملی پروگرام مرتب کر دیا ہے جس میں ہر قدم اسی منزل کی طرف اٹھتا ہے۔ نماز کے لئے پانچ وقت کا اجتماع۔ تقویٰ، ضبطِ نفس، غیر اللہ کی محکومی سے انکار، اللہ کی حاکمیت کا اقرار، مرکزیت، اجتماعیت، اطاعتِ امام کا عملی مظاہرہ ہے۔ جمعہ کے اجتماع میں یہ دائرہ وسیع تر ہو جاتا ہے۔ عید کی تقریب پر اس کی حدود اور زیادہ پھیل جاتی ہیں۔ اور بالآخر حج کے میدان میں اس کی وسعتیں ساری دنیا کو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہیں۔ رمضان مبارک کے پورے مہینے کی مشق و ریاضت کے بعد جب ذہنوں میں جلا، دلوں میں تازگیٔ ایمان، نگاہوں میں مومنانہ فراست اور خون میں مجاہدانہ حرارت پیدا ہوگئی تو عیدالفطر کے اجتماع میں ہر مقام سے ملّت اسلامیہ کی نمائندگی کے لئے بہترین افراد کا انتخاب ہُوا۔ مسلم نمائندوں کے یہ قافلے دنیا کے دُور دراز گوشوں سے جنگل، بیابان، کوہ اور دریا کے مرحلوں کو طے کرتے ہوئے۔ من کل فج عمیق اپنی بین الملی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے چاروں طرف سے ایک مرکز کی طرف سمٹتے چلے آ رہے ہیں۔ دنیا میں کوئی جماعت بلا مرکز قائم نہیں رہ سکتی۔ مسلمانوں کے فکر و نظر کا مرکز قرآن، اطاعت کا مرکز امیر اور اجتماعیت کا مرکز وہ بیت الحرام ہے جو ایک خدا کے ماننے والوں کے مورثِ اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقدس ہاتھوں سے معرضِ وجود میں آیا اور دنیا کے بتکدہ میں خدا کا پہلا گھر کہلایا۔ اِنَّ اوّل بیت

وضع للنّاس للذی ببکۃ مبارکاو ھدی للعلمین (۳/۹۵) بلاشبہ پہلا گھر جو تمام انسانوں کے لئے (بطور مرکز) بنایا گیا، وہ یہی ہے جو مکہ میں ہے۔ برکت والا اور تمام دنیا کے لئے ہدایت کا سرچشمہ۔ وَمَنْ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنا۔ جو کوئی اس کے حدود میں داخل ہوا وہ امن اور حفاظت میں آگیا۔

اسلام دنیا میں جس نظام کو قائم کرنے کے لئے آیا ہے اس کی بناء اس اصول پر ہے کہ تمام انسان ایک برادری کے فرد ہیں۔ وہ ان تمام غیر فطری حد بندیوں کو توڑنے کے لئے آیا ہے جن سے انسانوں کی یہ برادری مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ نسل کا امتیاز، رنگ اور زبان کا امتیاز، جغرافیائی حدود کا امتیاز اس کے نزدیک سب غیر فطری حد بندیاں ہیں۔ اس لئے خدا کے اس گھر میں جب انسان جمع ہونگے تو باطل کے ان امتیازات میں سے کوئی امتیاز باقی نہیں رہے گا۔ چینی، جاپانی، ہندی، افغانی ایرانی، تورانی، حبشی، افرنگی سب ایک ملت کی شکل میں اس عظیم الشان حقیقت کا اعلان کرنے کے لئے جمع ہونگے کہ

تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

یہی نہیں بلکہ مختلف قسم کے لباسوں سے جو اعلیٰ اور ادنےٰ کے امتیاز کی جھلک نمودار ہو سکتی ہے، اسلام نے اسے بھی روا نہیں رکھا اور حکم دیدیا کہ ارضِ حرم میں داخل ہونے سے پہلے سب ایک ایک بن سلی چادر میں لپٹے ہوئے حاضر ہوں۔ تاکس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری۔ یہ ہے وہ وردی جو اسی بین الملّی کانفرنس میں شرکت کرنے والوں کے لئے تجویز کی گئی ہے۔ یوں باطل کے ہر امتیاز کو مٹاتے، وحدت کے رنگ میں رنگے یہ قافلے چاروں طرف سے اپنے مرکز کی طرف بڑھتے چلے آرہے ہیں۔ سب ایک آقا کے غلام، ایک حاکم کے محکوم، ایک قانون کے تابع، ایک نظام کے پابند، فقیرانہ لباس، ننگے سر، گدایانہ وضع، قلندرانہ ادائیں، سکندرانہ جلال، دنیا بھر کے آستانوں سے بے نیاز، مستانہ وار گذرتے ہوئے چوکھٹ پر سر جھکانے کے لئے بے تاب، دل وفورِ شوق سے بےقرار، آنکھیں مئے توحید سے لنشہ بار، "لبیک اللھم لبیک" کہتے ہوئے یوں رواں دواں، جانبِ مرکز کھنچے چلے آرہے ہیں جیسے شہد کی مکھیاں، رنگ و بو کی فضاؤں کے جوہر اپنے سینوں میں بھر کر، سینکڑوں میل دُور کی مسافت طے کر کے شام کے وقت اپنے چھتے کی طرف پروانہ وار اڑتی چلی آرہی ہوں۔ کہ اپنی محنتوں کا سرمایہ، تگ و دو کا ماحصل، مرکز میں لاکر اکٹھا کر دیا جائے۔

زمانۂ ابراہیمیؑ میں رواج تھا کہ عہد و پیمان کی پختگی کے لئے ایک پتھر پر ہاتھ مارتے تھے جب

رہروانِ منزلِ شوق کے قافلے حریمِ کعبہ میں پہنچے تو اس عہد و پیمان کی تجدید کے لئے جو انہوں نے اپنے اللہ سے باندھ رکھا ہے، حجرِ اسود کو چھُوا۔ بعض نے ہجوم کی وجہ سے دُور ہی سے اشارہ کر دیا۔ کسی نے پیمان کے تقدّس کی رعائت سے ہاتھ کو چوم لیا اور یوں اس عہد کی تجدید ہوئی کہ :

ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین لاشریک لہ
وبذلک امرت وانا اوّل المسلمین

میری نماز، میرا حج، میرا جینا مرنا سب اللہ ہی کے لئے ہے جو تمام کائنات کا پروردگار ہے۔
اس کا کوئی شریک نہیں۔ مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں خدا کے فرمانبرداروں میں سب
سے پہلا فرمانبردار ہوں

اس عہد و پیمان کی تجدید سے، وجد و مسرت اور سرمستی و شیفتگی کی وہ کیفیت طاری ہوئی کہ والہانہ انداز میں خدا کے اس گھر کے گرد پروانہ وار گھوم رہے ہیں۔ کوئی کعبہ کی چوکھٹ پر سر رکھے محوِ نیاز ہے، کوئی اس کا غلاف تھامے عالمِ وارفتگی میں جھولی پھیلائے کھڑا ہے۔ دل میں مقدس آرزوؤں کا ہجوم، آنکھوں میں چمکتے ہوئے آنسو، لب پر دعائیں، محویت کا عالم، آسمان سے نور کی بارش، رحمتوں کا نزول غرضیکہ ایک نئی دنیا اور ایک عجیب سماں ہے۔

خم خانۂ حجاز کے متوالوں کے یہ قافلے ۸ تاریخ کو عرفات کے میدان کی طرف روانہ ہو گئے۔ پاک اور صاف، سر سے پاؤں تک للّٰہیت میں ڈوبے ہوئے، قدم وادیٔ مکّہ میں، نگاہیں عرشِ معلّیٰ پہ، کوئی تیزگام کوئی آہستہ خرام، کشاں کشاں ۹ تاریخ کو اس میدان میں آ جمع ہوئے۔ کیسا حسین نظارہ ہے۔ سب ایک آقا کے غلام، ایک مِلّت کے فرد ایک ہی وضع، ایک ہی انداز، بھائی سے بھائی ملا۔ ایک کا دوسرے سے تعارف ہُوا کہ اس مقام کا نام ہی عرفات کا میدان ہے۔ اجتماع کیا ہے؟ مساوات اور محبت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے۔ جس میں ہر قطرہ، اپنے آپ کو خود سمندر محسوس کرتا ہے۔ یہ سب خدا کے حضور جمع ہوئے ان کا منتخب امام۔ منبرِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر آیا۔ اس نے ملّت کی اجتماعی حالت پر تبصرہ کیا اور سال بھر کے لئے ایک مرتّب شدہ پروگرام کا اعلان کر دیا۔ جس کی تکمیل کے لئے دعائیں مانگی گئیں، التجائیں کی گئیں اور یوں یہ عظیم الشان اجتماع۔ زندہ آرزوؤں کی ایک نئی دنیا اپنے جلو میں لئے، دوسری صبح منیٰ کے میدان میں آ گیا۔ یہی وہ میدان ہے جہاں ملّتِ حنیفہ کے پیشوائے اعظم، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کرنے کے لئے پیشانی کے بل لٹا دیا تھا اور یوں اپنے ایمانِ محکم کا عملی ثبوت دیا تھا کہ تیرا حکم

ہو تو عزیز ترین متاع بھی بلا تامل نثار کر دی جا سکتی ہے۔ اس صحرائی قربان گاہ میں پہنچکر ملّتِ اسلامیہ کے ان نمائندوں نے اس اقرار کو دہرایا کہ تیرا نام بلند کرنے کے لئے جو پروگرام مرتب ہوا ہے۔ اس کی تکمیل میں جس قربانی کی ضرورت ہوگی بلا دریغ کر دی جائے گی۔ یہاں پہنچ کر مختلف ملکوں کے نمائندوں نے اپنے اپنے خیمے لگائے۔ یہ سب اللہ کے مہمان ہیں اس لئے خود ہی مہمان اور خود ہی میزبان ہیں۔ آج صبح ہندی مسلمانوں کے ہاں سب کے کھانے کا انتظام ہے۔ شام کو ایرانیوں کا اہتمام ہے ان دعوتوں کے لئے قربانیاں کی جا رہی ہیں۔ سامان تو کھانے پینے ہی کا ہے۔ لیکن چونکہ وہ مقصدِ عظیم جس کے لئے یہ اجتماع ہوا ہے خالصتہً اللہ کے لئے ہے اس لئے یہ دعوتیں بھی دنیا کی دعوتوں سے نرالی ہیں۔

لن ینال اللہ لحومھا ولا دماءھا ولکن ینالہ التقوی منکم کذالک سخرھا لکم لتکبروا اللہ علی ما ھداکم وبشر المحسنین (۲۲/۳۷)

اللہ تک ان قربانیوں کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا۔ بلکہ تمہارے دل کا تقویٰ، پاکیزگی مقصد پہنچتی ہے۔ اس نے ان جانوروں کو اس طرح تمہارے لئے مسخر کر دیا کہ تم اللہ کی راہنمائی پر اس کے نام کو بلند کرو اور نیک کرداروں کے لئے بشارت ہے۔

دعوتیں اور ضیافتیں ہیں۔ ایک ملک کے مسلمان دوسرے ملک والوں کو اپنے مقامی حالات سے آگاہ کر رہے ہیں۔ دماغی اور قلبی تعارف ہو رہا ہے۔ اِدھر اُدھر مختلف ملکوں کی مصنوعات کی نمائش لگ رہی ہے، خرید و فروخت ہو رہی ہے۔ لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلا من ربکم (۲/۹۸) اس میں کوئی حرج نہیں کہ تم (حج میں) اپنے رب کا فضل (یعنی معیشت) کمائو اس طرح یہ اجتماع ملّتِ اسلامیہ کے لئے دینی اور دنیاوی، سیاسی، اقتصادی، معاشی، معاشرتی فوائد کا ذریعہ بن رہا ہے کہ حج کا مقصد یہی ہے لیشھدوا منافع لھم تاکہ لوگ اپنے فوائد کے لئے حاضر ہوں۔

تین دن یہ اجتماع رہا جس میں عالمِ اسلامی کے ہر گوشے اور ملّت اسلامیہ کے ہر شعبے کے متعلق باہمی تبادلۂ خیالات ہوا۔

ادھر یہ ہو رہا ہے۔ ادھر تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ملّت کے افراد اپنے اپنے ہاں وادیٔ مکّہ کے اجتماع سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے عید گاہوں میں جمع ہو رہے ہیں۔ ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے نیز اس پروگرام کو سننے کے لئے جس کا اعلان ایک دن پہلے میدانِ عرفات میں ہوا ہے۔ اس

پروگرام کی اطلاعیں ریڈیو اور تار برقی سے تمام عالمِ اسلامی تک پہنچ چکی ہیں۔ مقامی مسلمان عید گاہوں میں پہنچے، اپنے اپنے خطیبوں سے اس پروگرام کو سن لیا اور سمجھ لیا جس پر اب سال بھر عمل کیا جائے گا۔ وہ نتائج یہ ہے عید۔ وہ فریضۂ مقدس جس میں نوعِ انسانی کے قیام و بقا کا راز ہے، تمام انسانوں کا اس لئے کہ مسلمان دنیا میں اپنے ہی لئے نہیں جیتا بلکہ اس کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ تمام دنیا کو اس نظام پر چلائے جس سے انسانیت بڑھے پھولے، پھلے اور عروج و ارتقاء کی منزلیں طے کر کے اس منزل سے اگلی منزل میں جا پہنچے۔ حج اس نظام کی سب سے اہم کڑی اور کعبہ اس نظام کا مرکز ہے جعل اللہ الکعبۃ البیت الحرام قیما للناس (۵/۹۷) اللہ نے کعبہ کو جو حرمت کا گھر ہے تمام انسانوں کے لئے قیام کا ذریعہ بنایا ہے۔ انسانوں نے مختلف خطوط پر مختلف قسم کی جمعیتیں بنا بنا اور بگاڑ بگاڑ کر مختلف تجربے حاصل کئے ہیں اور ہر تجربے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی ـــــ یہ سب اس لئے کہ جن اصولوں پر یہ جمعیتیں بنائی گئیں وہ سب غیر فطری تھے۔ فطرت کے مطابق تو ایک ہی اصول ہے اور وہ یہ کہ انسانوں کی تقسیم ملکوں اور قوموں کی رُو سے نہ کی جائے بلکہ تمام انسانوں کو عالمگیر برادری تصور کر کے انہیں ایک مرکز کے ماتحت خدا کے قانون کے تابع رکھا جائے۔ یہی وہ عظیم الشان اصول ہے جس کی رُو سے مکّہ کو ھدی للعلمین تمام دنیا کے لئے ہدایت کا سرچشمہ اور کعبہ کو قیاماً للناس تمام نوعِ انسانی کے لئے قیام کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ اس جمعیتِ آدم کا فطری نتیجہ ہے۔ دنیا کا امن و سکون ومن دخلہ کان امنا۔ جو اس میں داخل ہوا امن و حفاظت میں آ گیا۔

حج اور عید اسی منزل کے نشانِ راہ ہیں۔

علامہ غلام احمد پرویزؒ کی ایک نشری تقریر!

نوجوانوں کے لئے فکر و نظر کی نئی راہیں

سلیم کے نام

از پرویزؒ

عبداللہ ثانی۔ ایڈووکیٹ
پشاور

شریعت بل اور قرآن کریم

آج سے تقریباً چودہ سو سال قبل فخرِ کائناتؐ ایک جامع، مستند اور واضح کتاب "قرآن کریم" بنی نوعِ انسان کے ہاتھ میں دیکر اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ اللہ کی اس کتابِ عظیم کو نہ کسی سینٹ نے پاس کیا اور نہ کسی اسمبلی میں زیرِ بحث آئی۔ لیکن یہ حقیقت ناقابلِ تردید ہے کہ یہ کتاب مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ پوری کی پوری نوعِ انسانی کے لئے ایک زندہ و پائندہ ضابطۂ حیات ہے۔ جو قوم چاہے اسے آزما کر دیکھ لے لیکن شرط یہ ہے کہ کوئی دوسری کتاب، شریعت، فقہ، رواج، قیاس اجماع اس کے قریب نہ آئے۔ دنیا جانتی ہے کہ حضور صلعم نے جب اس کی عملی تفسیر پیش کی تو ان میں سے کوئی کتاب اس وقت موجود نہ تھی۔

ایک لمحے کے لئے اگر یہ تصور کر لیا جائے کہ قرآن کریم گزشتہ رات نازل ہوا ہے اور اسی ایک کتاب سے ہم نے اپنے مسائل کا حل تلاش کرنا ہے تو سارے جھگڑے ختم ہو جاتے ہیں

فرمانِ خداوندی ہے:

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

مفہوم:

بس یہی صورت ایک خدا کی اطاعت اختیار کرنے والوں کی اور ان کے مقابلہ میں، ان کی ہے جو مختلف آقاؤں کو اپنا خدا مانیں، تم لوگ مختلف خداؤں کے سامنے جھکتے ہو۔ کبھی تم نے اس پر بھی غور کیا ہے کہ ان خداؤں کی حقیقت اور اصلیت کیا ہے؟ بس اتنی ہی ہے کہ یہ محض چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ چھوڑے ہیں۔ ورنہ ان کی اپنی کوئی حقیقت اور پوزیشن نہیں۔ (تم سے کہا جاتا ہے کہ یہ خدا کے نمائندے ہیں، یہ بھی غلط ہے) خدا نے ان کے لئے کوئی سند نہیں بھیجی (کہ اس نے انہیں اپنے اختیارات دے رکھے ہیں)

یاد رکھو! اختیارات و اقتدارات کا واحد مالک خدا ہے۔ اس کے سوا حکومت کا حق کسی کو حاصل نہیں۔ اس کا فرمان یہ ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی محکومیت اور اطاعت اختیار نہ کی جائے۔ یہ ہے زندگی کا محکم اور استوار نقشہ لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔" ۱۲/۴۰، ۷/۱۷، ۵۳/۲۳۔

شریعت بل کی تمہید بڑے بڑے جلسوں، کے انعقاد کی تفصیل دے کر باندھی گئی ہے۔ اجلاس کی صدارت وزیر مذہبی نے فرمائی۔ شاید اس نسبت سے کہ وہ مذہبی امور کے وزیر ہیں، ورنہ عالمِ دین ہونے کا دعوےٰ تو شاید موصوف کو بھی نہ ہو۔

بل کے پیش لفظ میں بتایا گیا ہے کہ مقصد قرآن و سنّت کی بالادستی قائم کرنا ہے لیکن عملاً فوقیت نہ دلیل و برہان کو دی گئی نہ سند قرآن و سنّت قرار پائے۔ کمیٹی کے اپنے اعلان کے مطابق تمام فیصلے کثرتِ رائے سے ہوئے حالانکہ یہ تو شرکاء کو بھی معلوم ہوگا کہ کثرتِ رائے کا طریقِ کار قرآن کی میزان میں کچھ وزن نہیں رکھتا۔ فرمانِ خداوندی ہے:۔

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ۔ (۶/۱۱۶)

مفہوم:۔

"اب رہا یہ سوال کہ یہ ضابطۂ خداوندی، اس روش کے خلاف دعوت دیتا ہے جس پر نوعِ انسان کی اکثریت گامزن ہے تو یہ اعتراض کچھ وزن نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ کسی مسلک کے صحیح ہونے کی یہ دلیل نہیں کہ اسے اکثریت نے اختیار کر رکھا ہے۔ اگر تم (اس خیال کے مطابق) لوگوں کی اکثریت کا اتباع شروع کر دو تو یہ چیز تمہیں خدا کی راہ سے ہٹا کر گمراہ کر دے گی۔ دنیا کی اکثریت کا تو یہ عالم ہے کہ لوگ محض ظن و تخمین کے پیچھے ہو لیتے ہیں (اور یقینی علم کی بجائے) قیاس آرائیوں سے کام لیتے ہیں (اس کے برعکس خدا کی وحی جو کچھ پیش کرتی ہے وہ سرتاسر علم و حقیقت پر مبنی ہوتا ہے۔)"

یہ ہے اس بنیاد کی حقیقت جس پر شریعت بل کی عمارت استوار کی گئی ہے۔ کہنے کو یہ ایک بل ہے لیکن حیرت ہے کہ پارلیمنٹ میں پیش ہونے سے پہلے ہی اسے ایکٹ کی شکل دے دی گئی ہے۔

افتتاحی الفاظ ملاحظہ ہوں:۔

i مختصر عنوان، وسعت اور آغازِ نفاذ

ii　یہ ایکٹ نفاذِ شریعت ایکٹ ۱۹۸۹ء کے نام سے موسوم ہوگا۔
iii　یہ پورے پاکستان پر وسعت پذیر ہوگا۔
iv　یہ فی الفور نافذالعمل ہوگا۔
v　اس میں شامل کسی امر کا اطلاق غیر مسلموں کے شخصی قوانین پر نہیں ہوگا۔

باقی جو ہوگا سو ہوگا! جز (v) کو ملاحظہ فرمائیں۔ غیر مسلموں کے شخصی قوانین (PERSONAL LAWS) یعنی شریعت بل کے تحت منظور ہونے والے قوانین کا اطلاق غیر مسلموں کے شخصی قوانین پر نہیں ہوگا۔ مسلمانوں کے شخصی قوانین پر اطلاق ہوگا لیکن ہوگا ان کے متعلقہ فرقوں کی تعبیر و تاویل کے مطابق۔ گویا ہر مسلمان کو احکامِ خداوندی کی اطاعت کے لئے کسی نہ کسی فرقے کی بیعت کرنا ہوگی۔ جبکہ قرآنِ کریم کی مندرجہ ذیل آیات اس پر شاہد ہیں کہ محکومیت صرف قوانینِ خداوندی کی ہوگی۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ ۳/۷۸ (مزید ۶/۹۰، ۴۵/۱۶)۔

مفہوم:-

لیکن یہ چیز دین کے بنیادی اصول کے خلاف ہے۔ دین کا اصول یہ ہے کہ محکومیت خدا کے قانون کے سوا اور کسی کی اختیار نہیں کی جا سکتی۔ اس باب میں اس کا فیصلہ یہ ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ خدا اسے ضابطۂ قوانین، حکومت اور نبوت عطا کرے اور وہ لوگوں سے یہ کہنا شروع کر دے کہ خدا کے احکام کی جگہ میرے احکام کی اطاعت کرو۔ اس کی تعلیم یہی ہوگی کہ تم سب اس کتاب خداوندی کی اطاعت سے جس کی تم دوسروں کو تعلیم دیتے ہو اور جس پر غور و تدبر سے، اس کے مغز تک پہنچتے ہو، ربانی (یعنی اس کے نظامِ ربوبیت کے علم بردار) بن جاؤ۔

(۴)　عدالتیں شریعت کے مطابق فیصلہ کریں گی۔

یہ اتنی مہمل شق ہے جو کسی بھی ذی شعور شخص کے ذہن میں نہیں آسکتی۔ جب تک آپ سب شریعت پر متفق نہ ہوں۔ اُس وقت تک شریعت پر فیصلے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پورے ملک میں بسنے والی تمام قوم، مذہبی فرقے، سیاسی جماعتیں، ٹولیاں، غرض ایک نائب قاصد سے لے کر صدرِ مملکت تک تاحال لارڈ میکالے کے دیئے ہوئے قانون پر متفق ہیں۔ یہاں تک کہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو بھی یہ دفعہ یاد ہے،

کہ اگر کسی جگہ قتل ہو جائے تو دفعہ ۳۰۲ ت۔پ لگائی جاتی ہے۔ جب تک آپ یہ فیصلہ نہیں کریں گے کہ شریعت سے مراد احکامِ قرآنی ہونگے جس پر سب متفق ہیں۔ اس وقت تک یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ واضح حکم قرآنی ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

یاد رکھو! جو شخص قوانینِ خداوندی کے مطابق فیصلے نہیں کرتا جسے اللہ نے نازل کیا ہے وہ کافر ہے

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۵/۴۵)

یاد رکھو! جو شخص قوانینِ خداوندی کے مطابق فیصلے نہیں کرتا جسے اللہ نے نازل کیا ہے وہ ظالم ہے

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۵/۴۸)

یاد رکھو! جو شخص قوانینِ خداوندی کے مطابق فیصلے نہیں کرتا جسے اللہ نے نازل کیا ہے وہ فاسق ہے

ان آیات کی روشنی میں آپ خود فیصلہ کریں کہ کس شریعت کے مطابق فیصلہ کرنا چاہیئے۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ فیصلہ ہم اپنے بنائے ہوئے قوانین پر کریں اور نام اس کا شریعت رکھیں۔ یا قرآن کریم کے بعض حصّوں کو جو ہمارے مفاد میں ہوں مانیں اور جو ہمارے خلاف جائیں ان سے انکار کریں۔

(۵) پابندی' انتظامیہ کا کوئی بھی فرد بشمول صدرِ مملکت' وزیرِ اعظم' اور وزیرِ اعلیٰ شریعت کے خلاف کوئی حکم نہیں دے سکے گا۔ اور اگر کوئی ایسا حکم دے دیا گیا ہو تو اسے عدالت میں چیلنج کیا جا سکے گا۔

شق نمبر ۵ میں جس پابندی پر انتہائی زور دیا گیا ہے دراصل لاشعوری طور پر شخصیات کو کسی بھی طور تسلیم کرنے کا اثر ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہ تخصیص انتظامیہ سے کیوں روا رکھی گئی ہے۔ اس لئے کہ مذکورہ بالا تینوں عہدہ دار ریاستی امور میں انتظامی سربراہ سمجھے جاتے ہیں۔ اور وہ تقریباً ہمیشہ سے عام انسانوں سے مستثنیٰ تصور کئے جاتے رہے ہیں حالانکہ صرف اتنا بھی کافی تھا کہ:

"مُلک میں کسی بھی شخص کو احکامِ قرآنی کے خلاف کوئی حکم یا فیصلہ دینے کی اجازت نہ ہوگی۔"

البتہ شخص کی تشریح کر دی جاتی کہ شخص سے مراد "مرد یا عورت" (اگر ہو سکے تو مائین بھی کہہ دیا جائے) آپ تو ہنس دیئے ہیں۔ وہ اس لئے کہ ہر ممکن کوشش کے باوجود یہ ثابت نہ ہو سکا کہ "عورت سربراہِ مملکت ہو سکتی ہے کہ نہیں"۔ اگر ایسا ہو سکے تو عدالت میں چیلنج کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جس معاشرے کا اوڑھنا' بچھونا' قیاماً و قعوداً' اور قرآن الفجر کان مشہوداً' ہر قدم پر زندگی اسلام (یعنی قرآنِ کریم) کے رنگ میں رنگی ہو وہاں کسی ایسے حکم کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ:-

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۚ وَنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ۔ (۲/۱۳۸)

مفہوم :۔

"ان (نصاریٰ) سے کہو کہ نجات و سعادت، رنگ چھڑکنے (بچوں کو بپتسمہ دینے) سے حاصل نہیں ہوتی۔ یہ قانونِ خداوندی سے یک رنگ و ہم آہنگ ہونے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس رنگ سے زیادہ حسین رنگ اور کونسا ہو سکتا ہے؟ ان سے کہو کہ ہم نے اپنے لیئے یہی رنگ تجویز کیا ہے یعنی ہم نے خالص قوانینِ خداوندی کی اطاعت اختیار کی ہے۔ اس کے سوا ہم کسی کی محکومیت کو تسلیم نہیں کرتے۔

قارئینِ کرام! شریعت بل پر قرآنِ کریم کی روشنی میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن افسوس اس امر کا ہے کہ یہ لوگ قرآنِ کریم کے نزدیک آتے ہی نہیں۔ ورنہ چودہ سو سال قبل کی اس عظیم کتاب کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے یہ کل رات نازل ہوئی ہے اور "میری کہانی خود میری زبانی" مجھے سنا رہی ہے۔ شریعت بل کے چیدہ چیدہ دفعات پر عرض کر چکا ہوں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

اسلامی جمہوریت

وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸)

ان کا نظامِ حکومت باہمی مشورہ سے طے پاتا ہے

اسی کا نام اسلامی جمہوریت ہے۔ اس جمہوریت میں :۔

i نہ تو مغربی ڈیماکریسی کے مطلق اختیارات ہیں۔ جس میں کوئی اصول، غیر متغیر اور کوئی قدر مستقل نہیں اس میں برسرِ اقتدار پارٹی کی اکثریت جو قوانین چاہے بنائے۔ جب جی چاہے ان میں ردوبدل کر دے اور جس وقت چاہے انہیں منسوخ کر دے۔

ii نہ ہی اس میں ملوکیت یا ڈکٹیٹرشپ ہے کہ ایک فرد قوت کے زور پر ہر ایک سے اپنا حکم منواتا چلا جائے۔

iii نہ ہی اس میں تھیاکریسی ہے کہ کسی فرد یا جماعت کو خدائی اختیارات کا حامل سمجھا جائے۔ اس میں مذہبی پیشواؤں کا وجود ہی نہیں ہوتا۔

iv نہ ہی اس میں یہودی شریعت کی سی جکڑبندی ہے کہ زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملہ کے لئے بھی غیر متبدل ابدی قانون موجود ہو اور اُس "لوہے کے جوتے" سے پاؤں باہر نکالا ہی نہ جا سکے۔

عورت کا فریضۂ زندگی

(قندِ مکرّر)

سوال یہ ہے کہ ہمارے معاشرہ میں عورت کا مقام اور اس کا فریضۂ زندگی کیا ہے۔ جب یہ متعیّن ہو جائے گا تو اس کے بعد یہ سمجھنا آسان ہو جائے گا کہ ہر وہ شئے جو اسے اس مقام سے گرا دے۔ یا اس کے فریضۂ حیات کی سرانجام دہی میں رکاوٹ پیدا کرے ناروا اور ناواجب ہے۔

عیسائیت کی فطری تعلیم نے عورت کو تمام گناہوں کا سرچشمہ اور روحِ خبیث بتا کر اسے سوسائٹی کی نگاہوں میں اس درجہ ذلیل اور قابلِ نفرت بنا دیا کہ وہ صدیوں تک زمین کی چھاتی پر بوجھ بن کر پھرتی رہی۔ اس ناکردہ گناہ کی پاداش نے عورت کے تحت الشّعور میں مردوں کے خلاف بے پناہ جذبۂ انتقام پیدا کر دیا جو ان کے اس "مقدس استبداد" کے ساتھ ساتھ جسے کلیسا کے فتووں نے منزل من اللہ قرار دے رکھا تھا، آتشِ خاموش کی طرح سلگتا رہا۔ جس وقت یورپ میں کلیسا کا آہنی چنگل کمزور ہُوا، یہ سلگتی ہوئی آگ شعلۂ جوالہ بن کر بھڑک اٹھی اور جوشِ انتقام نے عورت کو بالکل پاگل بنا دیا۔ گذشتہ پچاس برس میں یورپ کی عورت نے اس ضمن میں جو کچھ کیا ہے وہ اس پاگل پن کا مظاہرہ تھا۔ کلیسا نے اپنے استبداد کو مذہبی تقدس کے نقاب میں چھپایا تھا۔ مغرب کی عورت نے اپنے جنونِ آتشِ انتقام کو آزادی کا نام دے کر اپنے آپ کو فریب دے لیا۔ مقصودِ فطرت نہ وہ تھا نہ یہ۔ وہ تفریط تھی یہ افراط۔ وہ جوئے زندگی کو گھٹا کر کم آب بنانا تھا۔ یہ شکستِ ساحل سے اسے سیلاب میں تبدیل کرنا۔ عورت کا صحیح مقام نہ وہ تھا نہ یہ۔ اس میں شبہ نہیں کہ مصافِ زندگی میں مردوں کے ہم دوش بلکہ بالائے سر ہونے کے جذبہ سے وہاں کی عورت نے جسمانی اور مادی طور پر بہت سے امور میں نمایاں ترقی حاصل کی ہے اور اس طرح بعض شعبوں اور گوشوں میں ان کی اس ترقی سے فائدہ بھی حاصل کیا گیا ہے۔ بالخصوص دورانِ جنگ میں۔ لیکن ان کے اپنے فطری مقام کو کھو دینے سے جو نقصانِ عظیم مغرب کو پہنچا ہے۔ اس کی تلافی کسی صورت میں نہیں ہو سکتی۔ وہاں کی عورت نے اس پچاس سالہ تگ و تاز اور سعی و کاوش کے بعد، عورت کا جو فریضۂ زندگی متعین کیا ہے وہ انہی کے الفاظ میں یہ ہے کہ (WOMAN'S MISSION ON EARTH IS TO DISPLAY CHARM)

"دنیا میں عورت کا مقصودِ زندگی نمائشِ حسن ہے"۔ یہ وہی چیز ہے جسے قرآن "تبرج الجاھلیہ" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے اور جسے اقبالؔ "جلوت کی ہوس" کہہ کر پکارتا ہے۔

رسوا کیا اس دور کو جلوت کی ہوس نے — روشن ہے نگہ، آئینۂ دل ہے مکدر[1]
بڑھ جاتا ہے جب ذوقِ ہوس اپنی حدوں سے — ہو جاتے ہیں افکار پراگندہ و ابتر
آغوشِ صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے — وہ قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر
خلوت میں خودی ہوتی ہے دل گیر و لیکن — خلوت نہیں اب دیر و حرم میں بھی میسّر

جلوت (یا تبرجِ جاہلیہ) سے مفہوم صرف بے پردگی نہیں اور نہ ہی خلوت سے مراد گھر کی چار دیواری میں بندش یا برقعہ کا نقاب ہے۔ پردہ کا مسئلہ الگ ہے۔ اس وقت ہم صرف اس نظریۂ حیات سے بحث کر رہے ہیں جو مغرب کی عورت نے اپنے لئے متعین کیا ہے۔

محکوم قوم نفسیاتی طور پر نقال ہو جاتی ہے اور وہ حاکم قوم کی ہر ادا میں اپنے لئے شانِ محبوبیت پاتی ہے۔ چونکہ اس کے قوائے عملیہ مفلوج ہو چکے ہوتے ہیں اس نقالی میں بھی وہ صرف ان باتوں کی تقلید کرتی ہے۔ جن کے اختیار کرنے میں کسی سعی و کاوش اور تگ و تاز کی ضرورت لاحق نہ ہو۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ محکوم، قومِ غالب کے محاسن و محامد کی تو نقل نہیں کرتی، ان کے نقائص و عیوب کو لپک لپک کر اختیار کر لیتی ہے۔ انگریز کی سو سالہ حکومت کے دوران میں، ہم نے ان سے سوٹ، سگریٹ، کالی ٹیبل برج سے زیادہ کچھ نہ سیکھا اور ہماری خواتین نے عریانی ساعد و سینہ اور رنگینیٔ غازہ و گلگونہ ہی میں یورپ کی عورت کی تقلید کا راز جانا۔ اب انگریز کا سانپ نکل چکا ہے لیکن اس کی یہ لکیریں، ہماری مایہ ناز تہذیب کی شکل میں، ہمارے پیکرِ زندگی پر منقوش ہیں۔ یہ ہے وہ نظریۂ حیات جس کا مظاہرہ ہماری خواتین کی محافل و مجالس میں آئے دن ہوتا رہتا ہے اور یہ ہے وہ زاویۂ نگاہ جسے ہم محلِ نظر سمجھتے اور قوم کے حق میں زہرِ ہلاہل تصوّر کرتے ہیں۔

قوم افراد کے مجموعہ کا نام ہوتی ہے اس لئے قوم کی متاعِ حقیقی اس کے فرزندانِ غیور و جسور ہوتے ہیں۔

قوم را سرمایہ اے صاحب نظر — نیست از نقد و قماش و سیم و زر
مالِ او فرزندہائے تندرست — تر دماغ و سخت کوش و چاق و چست

---

[1] قرآن نے جب کہا ہے کہ وہ کولنو قرادۃ خاسئین (وہ ذلیل بندر ہو گئے تو اس سے اس MENTALITY کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ان فرزندانِ جسور و غیور کی تربیت گاہ، ماں کی گود ہوتی ہے۔ قرآن نے قوم کے لئے امّت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور عربی زبان میں امّت کا مادہ اُم ہے جس کے معنی ہی ماں ہیں۔ لہٰذا قوم کی رُو سے امّت ماں ہی کی پیدا کردہ ہوتی ہے۔ اس لئے اس کے نزدیک عورت کا فریضۂ حیات ہے تعمیرِ ملّت۔

از امومِ پختہ تر تعمیرِ ما در خطِ سیمائے او تقدیرِ ما

"قوم کی تقدیر، فرزندانِ قوم کی ماؤں کی پیشانیوں سے ظاہر ہوتی ہے۔" اس لئے ماں کی آغوش

سیرتِ اقوام را صورت گر است

دورِ حاضرہ کے علم النفس کے ماہرین، بالخصوص علم تجزیۂ نفس کے امام، مثل فرائڈ، جنگ اور آڈلر اپنے عمر بھر کے تجربات و مشاہدات کے بعد جس نتیجہ پر پہنچے ہیں وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ بچے نے جو کچھ اپنی عمر میں بننا ہوتا ہے وہ آغوشِ مادر ہی میں بن چکتا ہے۔ بلکہ جنگ کے نظریہ کی رُو سے اس کی تعمیرِ سیرت کی ابتدا، پیدائش سے بھی پہلے شروع ہو جاتی ہے۔ چونکہ یورپ کی عورتیں اوّل تو بارِ امومت (MOTHER HOOD) ہی کو صعب انگیز تصوّر کرتی ہیں، اور پھر بچے کی پیدائش کے بعد اسکی پرورش اور تربیت کو اپنے پروگراموں میں حارج ہونے کا سبب، اس لئے ان بچوں کی پرورش بالعموم مشترکہ تربیت گاہوں میں ہوتی ہے۔ انہی ماہرینِ علم نفسیات کا فیصلہ ہے کہ اس طرح بچے گو جسمانی طور پر تندرست اور توانا ہوتے ہیں لیکن ان کے قلب و دماغ کی تربیت صحیح خطوط پر نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے ماں کی گود کے سوا اور کوئی گہوارا نہیں۔ انھوں نے بھی اس حقیقت کو اپنی قوم پر واضح کر دیا ہے کہ:

جہاں را محکمی از امہات است نہادِ شاں امینِ ممکنات است
اگر ایں نکتہ را قومے نداند نظامِ کاروبارش بے ثبات است

یورپ کے سامنے اپنا نظامِ زندگی ہے۔ اس سے ہمیں سردست بحث نہیں۔ ہم اپنا ایک مخصوص نصب العین حیات رکھتے ہیں اور ہماری قوم اس نصب العین کی حامل اور پیغام بردار نہیں ہو سکتی ہے۔ جب تک یہ نصب العین ہماری قوم کے نوجوانوں کے رگ و پے میں سرائت نہ کر چکا ہو اور یہ ناممکن ہے جب تک اس سلسلۂ تعمیرِ قلب و دماغ کی ابتدا ماں کی گود سے نہ ہو۔ اگر ہماری قوم کی خواتین و مخدرات مغرب کی عورتوں کی تقلید میں آرٹ اور موسیقی اور رقص و سرود ہی کو کمالِ زندگی تصور کرنے لگ گئیں اور اسی میدان میں مسابقت و منافست ہی وجۂ امتیاز و افتخار پا گیا تو ان درس گاہوں سے جس قسم کے نوجوان برومند ہونگے وہ ظاہر ہے۔ اس لئے کہ:

سیرتِ فرزندہا از امہات جوہرِ صدق و صفا از امہات

کہتے ہیں کہ ابدالی کی فوج میں ایک سپاہی شہید ہوگیا۔ جب فوج واپس گئی تو اس کی ماں نے دوسرے سپاہیوں سے اپنے لختِ جگر کی شہادت کا حال پوچھا۔ ایک سپاہی نے کہا کہ اس نے پیٹھ میں گولی کھائی تھی، سینے میں نہیں۔ ماں کا چہرہ تمتما اٹھا اور اس نے کامل یقین و وثوق کے ساتھ کہا کہ تم غلط کہتے ہو، میرا بچہ کبھی میدانِ جنگ سے نہیں بھاگ سکتا، اس لئے کہ میں نے اسے جو دودھ پلایا تھا اس میں ایک قطرہ بھی ایسا نہیں تھا جو ایسی خوراک سے بنا ہو جس کے رزقِ حلال ہونے میں شبہ ہو۔ اس لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ میدانِ جنگ سے بھاگ نکلے۔ ہم جانتے ہیں کہ تعلیم مغرب نے جس درجہ ہمارے ذہنوں کو ماؤف کر ڈالا ہے اس میں رزقِ حلال و حرام کے ایسے دور رس اثرات کو صحیح سمجھنے کے لئے ہماری طبائع کچھ تامل سا محسوس کریں گی۔ لیکن اتنا تو بہرحال ڈاکٹر واٹسن کے تجربات (BEHAVIOURISM) سے بھی واضح ہے کہ وراثت اور ابتدائی ماحول کے نقوش کس طرح انسان کی سیرت کو بدل ڈالتے ہیں۔ لہٰذا یہ حقیقت ہے کہ ہمیں جس قسم کے نوجوان مطلوب ہوں، اسی قسم کی تربیت گاہیں درکار ہونگی۔ اور یہ تربیت گاہیں ماں کی گود سے الگ کہیں نہیں ہوسکتیں۔ اس لئے ہم اپنی قوم کی خواتین سے باادب گذارش کریں گے کہ تقلیدِ مغرب میں ان کی یہ روشِ زندگی، ایک بہت بڑے قومی نقصان کا موجب بن رہی ہے۔ جس انا کا دودھ آپ کا بچہ پیتا ہو، اس انا کی خوراک پر آپ خاص نگاہ رکھتی ہیں۔ اس لئے نہیں کہ غلط خوراک سے انا کو تکلیف ہو جائے گی بلکہ اس لئے کہ اس کا اثر آپ کے بچے کی صحت پر پڑے گا۔ جب آپ بچے کی جسمانی صحت کے متعلق اس قدر خیال رکھتی ہیں تو اس کی تربیت کی طرف بھی تو خیال رکھئے۔ اور اس کی تربیت کا گہوارہ خود آپ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح انا کے سپرد کیا ہوا بچہ، اس کے پاس بطور امانت ہوتا ہے۔ اسی طرح آپ کے بچے دراصل قوم کی متاعِ عزیز ہیں اور آپ کے پاس بطور امانت آپ کو اس امانت کے بارے میں بڑی احتیاط برتنی ہوگی۔ کوئی ماں بارِ امومت کے زمانہ میں اونچا نیچا قدم نہیں رکھتی۔ اس لئے کہ اس سے جنین کی موت کا اندیشہ ہوتا ہے۔ لہٰذا آپ کو روشِ حیات میں بھی کوئی قدم غلط سمت میں نہیں اٹھانا چاہیئے کیونکہ اس سے قوم کے بچوں کی سیرت کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ آپ کی تعلیم صحیح نہج پر نہیں ہوئی اس لئے آپ کے لئے اس کے غلط اثرات سے نکل جانا ذرا دشوار ہے۔

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن — کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن — ہے عشق و محبت کیلئے علم و ہنر موت

لیکن انگریزی مکاتب نے وہ تعلیم اپنے مقاصد کے پیشِ نظر دی تھی۔ وہ چاہتے ہی نہیں تھے کہ آپ کی گود

سے ایسے بچّے جوان ہوں جو اُن کی حکمتِ فرعونی کے لئے عصائے حکیمی بن جائیں. لیکن مبدائے فیض کی کرم گستری نے جب ہمارے حالات بدل دیئے ہیں تو ہمیں بھی اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش کرنی چاہیئے. حصولِ پاکستان کے بعد ہمارے فرائض اور ہو چکے ہیں اور ہماری ذمہ داریاں مختلف. اب ہمیں ان ذمہ داریوں کے پیشِ نظر، اپنی رفتار و کردار میں تبدیلی کرنی ہوگی. اگر ہم نے حالات کے مطابق اپنی روش کو نہ بدلا تو ہم ان نئی ذمہ داریوں سے عہدہ برا نہیں ہوسکیں گے. اور پھر جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے، آپ کے زاویۂ نگاہ کی تبدیلی سے تو قوم کے مستقبل کی تبدیلی وابستہ ہے. پاکستان کا مستقبل، ہماری آنے والی نسلوں کے ہاتھ میں ہے اور وہ نسلیں اسی قسم کی ہوں گی جس قسم کا آپ انہیں بنا دیں گی. اگر آپ نے عورت کا مقصدِ زندگی وہی سمجھا جو یورپ کی عورت نے اپنے لئے متعین کیا ہے یعنی نمائشِ جمال، تو قوم ان نوجوانوں سے محروم رہے گی جن کا شیوۂ زندگی یہ ہوتا ہے کہ:

اگر ہو جنگ تو شیرانِ غاب سے بڑھ کر اگر ہو صلح تو رعنا غزالِ تاتاری

یعنی وہ نوجوان کہ

شباب جس کا ہے بے داغ ضرب ہے کاری

مغرب کی تہذیب کائنات کے خارجی پہلوؤں کو ہی ماحصل کائنات سمجھتی ہے اس لئے اس تہذیب کا دائرہ عمل ہی ظہور و نمود میں ہے. وہ ضمیرِ انسانی کی مستور دنیا سے کچھ علاقہ نہیں رکھتی اس لیے وہ بطونِ خفایا کے جذب دروں سے لذت آشنا نہیں. لہٰذا آپ کی تہذیب تو آپ کے سامنے ایسی دنیائیں لاتی ہے جن تک مغرب کی عورت کی نگاہ ہی نہیں پہنچ سکتی. تقلیدِ مغرب میں اسی تنگنائے مادیت ہی کو تمام کائنات تصور کر لینا فکر و نظر کی کوتاہی ہے اس لئے آپ سے گزارش ہے کہ:

اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

یاد رکھئے! اسلام جس تہذیب کو آپ کے سامنے رکھتا ہے وہ کوئی ایسی گھناؤنی شئے نہیں جس کے تصور سے آپ کی روح میں کپکپی پیدا ہو جائے. اس تہذیب میں عورت کو اس کا وہ مقام حاصل ہوتا ہے جو آج تک اسے کسی اور تہذیب نے عطا نہیں کیا. اس لئے اپنے ہاں کے گوہرِ نایاب کو چھوڑ کر دوسروں کے خزف ریزوں کو سمیٹتے پھرنا کہاں کی دانش وری ہے. ہمیں اگر اپنے مسلمان ہونے پر فخر ہے تو ہمارے سامنے زندگی کا اسوہ (MODEL) بھی انہی خواتینِ عظمےٰ کا ہونا چاہیئے جو شجرِ اسلام کے گلِ سرسبد کی حیثیت رکھتی تھیں. اس سیدۃ النساءؓ کا اسوۂ حسنہ جس کی حیاتِ طیبہ یہ تھی کہ

آسیا گرداں و لب قرآں سرا

اس مقام پر ہم اپنی ان محترم خواتین سے خاص طور پر خطاب کرنا چاہتے ہیں جو ہمارے معاشرہ میں آج ممتاز حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ محض اللہ کا احسان و انعام ہے کہ اس نے آپ کو یہ مقام عطا فرمادیا۔ لیکن اس مقام بلند کے جتنے بڑے مدارج ہیں اتنی ہی اہم اس کی ذمہ داریاں بھی ہیں۔ آپ اس مقام پر ہیں، جہاں سے آپ کی ہر روش دوسروں پر بھی اثر انداز ہوتی ہے اور وہ آپ کی زندگی کو اپنے لئے نمونہ بناتی ہیں اس لئے آپ پر دُہری ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ ایک لپنے آپ کی، ایک دوسروں کی۔ فلہٰذا آپ کیلئے اور بھی ضروری ہے کہ آپ اپنے سامنے وہی نصب العین زندگی رکھیں جو اسلام نے آپ کے لئے متعین کیا ہے اور آپ کا کوئی قدم اس راہ سے الگ نہ اٹھے جو راہ اس نصب العین کی طرف لے جانے والی ہے۔ پاکستان میں بے شمار کام آپ کے کرنے کے ہیں۔ ان کی طرف توجہ دیجئے "طاؤس و رباب" قوموں کو سلانے کا کام دیتے ہیں، جگانے کا نہیں۔ حالانکہ اگر اللہ نے ہماری شبِ غلامی کو ختم کیا ہے تو آپ کا فریضہ یہ ہے کہ قوم کے بچوں کو جگانے کی فکر کریں "طبِّ مغرب" نے یہ افیون محض اس لئے ایجاد کی تھی کہ اس سے محکوم قوم کے بچّوں کو سلانے کا کام لیا جائے اس افیون کی ڈبیا کو بہ تشکر واپس کر دیجئے اور ان سے کہہ دیجئے کہ جو کچھ ربِ حکیم نے ہمارے لئے تجویز کیا ہے وہ اس سے کہیں بہتر ہے ملّت کا احیاء اور اس میں قرآن کی روح کا نفوذ، آپ ہی کے ہاتھوں سے ہوسکتا ہے۔ اس لئے کہ

حافظِ رمزِ اخوّت مادراں قوّتِ قرآن و ملّت مادراں

اسلام کی خواتین کے لئے باعثِ فخر و نازش، واجب التکریم مائیں بن کر امت کی تعمیر کرنا اور اس کی زندگی میں جی کر حیاتِ دوام حاصل کرنا ہے، نہ کہ چینی کی گڑیائیں بن کر دل بہلانے کا سامان فراہم کرنا اور ٹوٹ جانا۔

(طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۴۸ء سے ماخوذ)

عوام

سفارشوں کے ہجوم ہرسو، امارتوں کے جنون ہر سو
ہیں آنسوؤں کے نجوم ہرسو، دلوں پہ کالک جمی ہوئی ہے
عجب یہاں بےحسی سی ہے طاری، نہ جی رہے ہیں نہ مر رہے ہیں
"یہ سب تمہارا کرم ہے آقا کہ بات ابتک بنی ہوئی ہے"

قاسم نوری

اسلامی قانون شریعت کے ماٰخذ

لاہور سے ایک صاحب لکھتے ہیں :۔

" سینٹ کے منظور کردہ شریعت بل کی شق ۴ (ب) میں شریعت کے ماٰخذ قرآن، سنّت، اجماع اور قیاس بتائے گئے ہیں۔ قرآن اور سنّت کی بات تو سمجھ میں آتی ہے، یہ اجماع اور قیاس کیا ہیں؟ اگر سبھی اصطلاحات کی وضاحت فرما سکیں تو عنائت ہوگی۔! "

سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ ان اصطلاحات کا مروّجہ مفہوم کیا ہے؟ واضح رہے کہ یہ موضوع یکسر فنّی اور اصطلاحی ہے لیکن ہماری کوشش ہوگی کہ فنّی اصطلاحات میں الجھائے بغیر، عام فہم الفاظ میں بات کی جائے۔

قیاس

پہلے قیاس کو لیجئے۔ اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ جب اسلام دُور دراز ملکوں تک پہنچا اور مسلمانوں کا ربط وضبط مختلف اقوام سے ہُوا تو اس قسم کے معاملات سامنے آئے، جن کے متعلق نہ قرآن میں کوئی تفصیلی حکم موجود تھا اور نہ ہی احادیث میں ایسا حکم ملتا تھا۔ اس لئے فقہاء نے عقل اور رائے سے کام لے کر قرآن اور حدیث کے ملتے جُلتے احکام سے زیرِ نظر معاملات کے متعلق نئے احکام مستنبط کئے، اس کا نام قیاس ہے۔ یعنی ایک بات سے دوسری بات کا اندازہ کرنا۔ انگریزی میں اسے (ANALOGICAL REASONING) کہتے ہیں۔ اسے ایک مثال سے یوں سمجھو کہ قرآن کی رُو سے خمر (شراب) ممنوع ہے۔ لیکن بھنگ کے متعلق قرآن اور حدیث میں بالصراحت کوئی حکم نہیں ملتا اب ایک فقیہہ جو قیاس سے کام لے گا وہ یہ کہے گا کہ شراب اس لئے ممنوع ہے کہ اس میں نشہ ہوتا ہے لہٰذا اگر بھنگ میں نشہ ہے تو وہ بھی ممنوع ہے۔ اور اس سے یہ مسئلہ مستنبط ہُوا کہ ہر نشہ آور شئے ممنوع ہے۔ اس طرح استنباطِ مسائل کو اجتہاد بھی کہتے ہیں۔ جس کے معنی کوشش کرنا (TO EXERT) ہیں۔

قیاس کے جواز اور عدم جواز کے بارے میں بھی دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ اسے بالکل ناجائز قرار دیتا ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن کریم ایک مکمل کتاب ہے جس میں ہر بات کا حکم موجود ہے۔ لہٰذا شریعت کے

معاملات میں قرآن نے قیاس کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔ متقدمین میں ظاہری فرقہ کے مسلمان اسی خیال کے تھے اور متاخرین میں پنجاب کے فرقہ اہل قرآن نے اسی مسلک کو اختیار کیا تھا۔ لیکن نہ ظاہری مسلک زمین گیر ہو سکا اور نہ ہی اہلِ قرآن کا فرقہ آگے بڑھ سکا۔ اس لئے کہ ان کا بنیادی تصور خود منشائے قرآنی کے خلاف تھا۔ اسی خیال کا ایک دوسرا گروہ وہ ہے جو یہ کہتا ہے کہ تنہا قرآن نہیں بلکہ قرآن اور حدیث دونوں کو اکٹھا کر لیا جائے تو ان میں تمام معاملات کے احکام مل جاتے ہیں۔ اور کوئی بات ایسی نہیں رہ جاتی جس کے لئے کسی نئے فیصلے کی ضرورت پڑے۔ فسادات پنجاب کی تحقیقاتی عدالت میں محترم ابوالحسنات صاحب نے یہی کہا تھا کہ اسلام میں ہر معاملہ کے متعلق پہلے سے احکام موجود ہیں، اس لئے اس میں قانون سازی کی گنجائش نہیں۔

جو لوگ قیاس کے حق میں ہیں وہ قرآن اور حدیث دونوں سے اپنے مسلک کی تائید پیش کرتے ہیں البتہ ان میں اس باب میں اختلاف ہے کہ قیاس کی کہاں ضرورت پڑتی ہے اور وہ کس حد تک قابلِ قبول ہے۔ اہلِ حدیث حضرات کا عام طور پر یہ عقیدہ ہے کہ حدیث خواہ ضعیف ہی کیوں نہ ہو، اسے قیاس پر ترجیح دی جائے گی۔ لہٰذا ان کے نزدیک قیاس کے ذریعہ اجتہاد کی وسعت بہت محدود ہے۔ اسکے برعکس دوسرا گروہ (جنہیں اہل الرائے کہا جاتا ہے اور جن کے سرخیل امام ابوحنیفہؒ ہیں) قیاس کو بڑی وسعت دیتا ہے۔ یہ مشہور ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے اپنی فقہ مرتب کرتے وقت، احادیث سے بہت کم مدد لی ہے، اتنی کم کہ ان کے ہاں سترہ اٹھارہ حدیثوں سے زیادہ ملتی ہی نہیں۔ وہ قرآن کو سامنے رکھتے تھے اور اسی کی روشنی میں نئے نئے معاملات کے متعلق استنباطِ احکام کرتے تھے۔ اہل حدیث اور اہل الرائے حضرات میں یہی بنیادی وجہ اختلاف ہے۔ چونکہ امام اعظمؒ کوفہ کے رہنے والے تھے (اور کوفہ عراق میں ہے) اس لئے ان کے مسلک کو اہل عراق کا مذہب بھی کہتے ہیں ـــــ مذہب کے معنی (RELIGION) نہیں، بلکہ (SCHOOL) کے ہیں۔ اہل حدیث اور اہل الرائے کے اس بنیادی اختلاف کے علاوہ خود اہل الرائے (اہل فقہ) کے مختلف مذاہبِ فکر (SCHOOLS OF THOUGHT) میں جو اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ ان کے ائمہ کے قیاس میں اختلاف ہے۔ چنانچہ ہارٹن (HORTON) کی تحقیق کے مطابق نویں اور بارہویں صدی عیسوی کے دوران مسلمانوں میں کم و بیش ایک سو فقہی مذاہب پیدا ہو چکے تھے اور علامہ اقبالؒ کی تصریح کے مطابق پہلی صدی ہجری کے وسط سے چوتھی صدی تک قریب انیس فقہی مذاہب وجود میں آ چکے تھے

اہل الرائے اور اہل قیاس حضرات، جنھوں نے اہل حدیث حضرات سے اس بنیادی نقطہ پر اختلاف

کیا تھا کہ زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں سے نت نئے مسائل (PROBLEMS) سامنے آتے رہتے ہیں۔ جن کے لئے فکر اور قیاس ہی سے احکامات مستنبط کئے جا سکتے ہیں۔ اس لئے اجتہاد ناگزیر ہے۔ خود کچھ عرصہ کے بعد اس عقیدہ کے ہو گئے کہ اب آئندہ کے لئے اجتہاد کا دروازہ بند ہے۔ جو کچھ سوچا جانا تھا، سوچا جا چکا، جتنا کچھ قیاس کیا جانا تھا کیا جا چکا۔ اب آنے والی نسلوں کے لئے انہی فیصلوں کی پابندی لازمی ہے جو ان کے ائمہ اسلاف کر چکے ہیں وہ ان سے ادھر ادھر نہیں ہٹ سکتے۔ "مقلد اور غیر مقلد" کے الفاظ زبان زد عام ہیں۔ مقلد یہی لوگ کہلاتے ہیں جو ائمہ اسلاف کے فیصلوں کی تقلید ضروری سمجھتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ غیر مقلد وہ ہوں گے جو اجتہاد کا دروازہ کھلا سمجھتے ہیں۔ بالکل نہیں۔ اجتہاد کا دروازہ تو ان میں سے کوئی بھی کھلا نہیں سمجھتا۔ مقلد اور نہ غیر مقلد مقلد وہ ہیں جو ائمہ فقہ کے فیصلوں کی تقلید کرتے ہیں۔ اور غیر مقلد وہ جو حدیث کی پیروی کرتے ہیں۔ اجتہاد کا سوال نہ ان کے ہاں ہے نہ ان کے ہاں۔ یعنی اس اعتبار سے دونوں کا مقام ایک ہی ہے کہ جو فیصلے ہونے تھے ہو چکے۔ اب قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے انہی فیصلوں کی اتباع لازمی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک گروہ کہتا ہے کہ یہ فیصلے فقہ کی کتابوں میں درج ہیں۔ دوسرا کہتا ہے کہ یہ احادیث کے مجموعوں میں ہیں۔ ان مقلدین میں بھی مختلف گروہ ہیں۔ بعض صرف مطلق اجتہاد کے بند ہونے کے قائل ہیں اور بعض بہر نوع تقلید کے قائل۔ لیکن یہ فنی اور فروعی باتیں ہیں جن کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ بنیادی چیز وہی ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اجتہاد کا دروازہ کھولنے والوں نے اسے خود اپنے ہاتھوں سے بند کیوں کر دیا؟ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ لیکن سب سے بڑی (اور یوں سمجھئے کہ آخری) وجہ زوالِ بغداد تھا۔ ملتِ اسلامیہ کا دینی مرکز تو مدت ہوئی ختم ہو چکا تھا۔ بغداد کی تباہی کے بعد (جو تیرہویں صدی عیسوی میں ہوئی تھی) ان کی سیاسی مرکزیت بھی تباہ ہو گئی تھی۔ اور امت میں ہر طرف انتشار ہی انتشار پھیل گیا تھا۔ ان حالات میں (علامہ اقبال کے الفاظ میں)

> "امت کو مزید انتشار سے بچانے کے لئے، جو سیاسی زوال کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ قدامت پسند مفکرین نے یہی سوچا کہ قوم میں معاشرتی وحدت کو قائم رکھا جائے۔ اور اس کا یہی طریقہ تھا کہ شرعی مسائل کے متعلق جو فیصلے فقہائے اسلام پہلے کر چکے تھے۔ سب پر انہی کی پابندی لازم قرار دے دی جائے اور نئے فیصلوں کا دروازہ بند کر دیا جائے۔ یعنی ان کے پیشِ نظر ملت کا معاشرتی نظم تھا۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اس

باب میں کسی حد تک حق بجانب بھی تھے۔ اس لئے کہ جماعتی نظم زوال آور عناصر کی کچھ نہ کچھ روک تھام تو کر ہی دیتا ہے۔" (خطبات ص ۱۴۲-۱۴۳)

اس وقت کے اربابِ شریعت کے پیشِ نظر یہی مصلحت ہوگی لیکن اس وقتی مصلحت نے اسلام اور مسلمانوں کو کس قدر مستقل نقصان پہنچایا ہے! اس نے فکر کا دروازہ بند کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ امت میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی مفقود ہوگئی اور اسلام جو ایک حرکت (MOVEMENT) کا نام تھا۔ منجمد اور متحجر (FOSSILISED) رسوم کا مجموعہ بن کر رہ گیا۔ چنانچہ علامہ اقبالؒ مندرجہ بالا اقتباس کے تسلسل میں لکھتے ہیں:۔

"(اس وقت کے اربابِ شریعت نے اس مصلحت کو تو پیشِ نظر رکھا) لیکن انہوں نے اس حقیقت کو نہ سمجھا اور نہ ہی اسے ہمارے موجودہ علماء سمجھتے ہیں کہ کسی قوم کے مستقبل کا انحصار ان کے جماعتی نظم پر اتنا نہیں ہوتا جتنا افراد کی قوت اور صلاحیت پر ہوتا ہے۔ ایک ایسے معاشرے میں جس میں جماعتی نظم پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جائے، فرد کی انفرادیت کچل کر رہ جاتی ہے وہ اپنے گرد و پیش کے معاشرتی فکر کی دولت کا مالک تو بن جاتا ہے لیکن اس کی اپنی روح مردہ ہو جاتی ہے (یاد رکھئے) قوموں کے زوال کا علاج ان کے ماضی کی تاریخ کے جھوٹے احترام اور اس کے مصنوعی احیاء سے نہیں ہو سکتا۔"

یہ ایک بہت بڑی حقیقت ہے جسے حضرت علامہ چند الفاظ میں بیان کر گئے ہیں۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے اپنے زمانے کی ان مذہبی جماعتوں پر غور کیجئے جو اسلام کے احیاء اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا دعویٰ لے کر اٹھتی ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ

(۱) ان کی دعوت کا مرکزی نقطہ یہ ہوتا ہے کہ ہمیں اسلاف کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیئے۔ ہمیں اپنے ماضی کو دوبارہ زندہ کرنا چاہیئے۔ ہماری ترقی کا راز اتباعِ سلف میں ہے اور

(۲) اگر کوئی شخص قوم کو غور و فکر کی دعوت دے تو ان کی طرف سے فوراً یہ آواز بلند ہو جاتی ہے کہ اس فتنہ کو کچل دو۔ یہ امت میں انتشار کرنا چاہتا ہے۔ یہ ایک نیا اسلام ایجاد کرنا چاہتا ہے۔

یعنی وہ اپنے جماعتی نظم کو اسلاف کے نام کی غلط تقدیس اور ان کے مسلک کی متشدد تقلید کے زور پر قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ آپ اس قسم کے جماعتی نظم پر گہری نگاہ ڈال کر دیکھیں آپ کو نظر آجائے گا کہ اس میں افراد کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب ہو جاتی ہیں۔ وہ اسلام کی سب سے بڑی خدمت اسی میں سمجھتے ہیں کہ اپنے قائدین کے ہر حکم کی اطاعت کی جائے اور ان کے کسی فیصلے

پر تنقیدی نگاہ نہ ڈالی جائے۔ وہ اپنے جماعتی تعصّب کو مذہب سے والہانہ شیفتگی سمجھتے ہیں۔ اور اس مقدس فریب میں مبتلا رہتے ہیں کہ ہمارے اس جہاد سے ملّت کو عروج اور اسلام کو ترقی نصیب ہوگی۔ یہ وہ رجحان تھا جو زوالِ بغداد کے بعد پیدا ہوا اور ابھی تک بدستور چلا جا رہا ہے۔ بلکہ پاکستان میں بدقسمتی سے اسے اور بھی شدّت کے ساتھ ابھارا جا رہا ہے۔ اسی کو علامہ اقبالؒ نے "جماعتی نظم پر ضرورت سے زیادہ زور۔ ماضی کا جھوٹا احترام اور اس کا مصنوعی احیاء" قرار دیا ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:-

> "جیسا کہ دورِ حاضر کے ایک مصنّف نے کہا ہے "تاریخ" کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ خیالات اور نظریات جو اپنی توانائی کھو کر فرسودہ ہو چکے ہوں۔ ان لوگوں میں کبھی پھر سے توانائی حاصل نہیں کر سکتے جنھوں نے انہیں فرسودہ بنا دیا ہو" لہٰذا زوال آور عناصر کی روک تھام کا موثر طریقہ صرف یہ ہے کہ قوم میں نجود خزیدہ (SELF - CONCENTRATED) افراد کو پیدا کیا جائے۔ یہی وہ افراد ہیں جو زندگی کی گہرائیوں کے سربستہ راز کھولتے ہیں۔ وہ ایسے نئے معیارِ زلیست سامنے لاتے ہیں جن کی روشنی میں ہم یہ دیکھنا شروع کر دیتے ہیں کہ ہمارا ماحول ایسا غیر متبدّل نہیں کہ اسے چھُوا تک نہ جائے۔ تیرھویں صدی اور اس کے بعد کے علماء کا یہ رجحان کہ ماضی کی غلط تقدیس سے جماعتی نظم کو جامد اور مصلّب طور پر قائم رکھا جائے، اسلام کی روح کے یکسر خلاف تھا۔" (ص ۱۴۴)

ملاحظہ فرمایا آپ نے! کہ اتنے بڑے اہم مسئلہ کو حضرت علامہؒ نے چند الفاظ میں کس حسن و خوبصورتی سے حل کر دیا ہے!

تصریحاتِ بالا سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ قیاس درحقیقت شرعی قوانین کی تدوین کا ایک طریقہ (PROCESS) تھا۔ ان قوانین کا مآخذ (SOURCE) نہیں تھا لیکن جب ہمارے دورِ انحطاط میں فکر و تدبّر کا دروازہ بند ہو گیا تو یہی چیز قانونِ شریعت کا مآخذ قرار پا گئی۔ یعنی اس وقت عقیدہ یہ پیدا کر لیا گیا کہ اسلاف نے اپنے قیاس (اجتہاد) سے جو مسائل مستنبط کئے ہیں وہ اخلاف کے لئے غیر متبدّل قوانین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا فقہ کی کتابیں ہمارے قوانینِ شریعت کا سرچشمہ ہیں۔

اجماع

قیاس کے بعد، قوانینِ شریعت کا دوسرا مآخذ اجماع قرار دیا جاتا ہے۔ قیاس کے متعلق تو

مختلف گروہوں کے اختلاف ایسے شدید اور وسیع نہیں تھے۔ لیکن اجماع کے متعلق صورت عجیب تر ہے اوّل تو آج تک یہی طے نہیں پاسکا کہ اجماع سے مراد کیا ہے؟ اور جو کچھ طے پایا ہے اس میں مختلف گروہوں کا اختلاف بڑا گہرا ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ عہدِ حضرت عمرؓ تک امّت میں کسی قسم کا اختلاف نہیں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے نظام میں اختلاف ہو ہی نہیں سکتا۔ حضرت عثمان رضؓ کے زمانے میں مسئلۂ خلافتِ حضرت علیؓ کے نام پر امّت میں سب سے پہلا اختلاف رونما ہوا۔ غیر شیعہ حضرات اس اختلاف کو سیاسی کہتے ہیں لیکن شیعہ حضرات کے قریب یہ وہی مسئلہ تھا اور بڑا بنیادی۔ بہر حال مسئلہ سیاسی تھا یا دینی اس کی وجہ سے جو اختلاف پیدا ہوا وہ غیر مندمل تھا۔ اس اختلاف کے بعد کوئی مسئلہ ایسا ہو نہیں سکتا جس کے متعلق کہا جائے کہ اس پر پوری امّت کا اجماع تھا۔ لہٰذا اجماع سے مراد ساری امّت کا اجماع نہیں۔ فقہاء کے نزدیک کسی حکمِ شرعی پر کسی زمانہ میں مسلمان مجتہدین کا متفق ہو جانا اجماع کہلاتا ہے۔ واضح تر الفاظ میں اجماع کی فنّی تعریف یہ ہے کہ:۔

> "رسول اللہؐ کی وفات کے بعد، کسی بھی دور میں امّتِ محمدیہؐ کے مجتہد کسی پیش آمدہ حادثہ پر خوب بحث و تحیص کرکے ایک ہی وقت میں ایک ہی جگہ پر ایک ہی جیسے الفاظ میں اعلان کریں۔ اس میں اگر کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا تو یہ اجماع حقیقی کہلائے گا۔"

اس قسم کے اجماع کے شرعی دلیل ہونے یا نہ ہونے میں اختلافات تو ایک طرف علماء کے ایک گروہ نے اس کے وجود کے امکان ہی سے انکار کر دیا ہے اور بات ہے بھی ٹھیک۔ وہ کونسا مسئلہ ہے جس کے متعلق یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ امّت میں اس قسم کا اجماع کبھی ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ائمہ نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اس قسم کے اجماع کا مدعی جھوٹا ہے۔

اجماع کی دوسری شکل یہ بیان کی جاتی ہے کہ چند مجتہد ایک بات کہہ کر اس دور کے تمام مجتہدوں میں مشتہر کردیں۔ اگر کسی نے اس کے خلاف یا تائید میں کچھ نہیں کہا تو اسے اجماع سکوتی کہا جائیگا۔ یعنی ان کا چپ رہنا اس کی دلیل ہے کہ وہ اس سے متفق ہیں۔ ایک گروہ نے اس کے بھی حجتِ شرعی ہونے سے انکار کیا ہے۔ دوسری طرف اس کے موافقین کا گروہ ہے کہ وہ منکرینِ اجماع کو کافر تک کہہ دیتے ہیں۔ بعض کے نزدیک صرف اہلِ مدینہ کا اجماع شرعی دلیل بن سکتا ہے۔ بعض کے نزدیک صحابہؓ کا اجماع۔ ان علماء کی بحثوں سے قطع نظر۔ آپ دیکھئے کہ امّت میں فرقہ بندی کے بعد اگر کبھی کسی مسئلہ میں اجماع ہوگا بھی تو وہ ایک فرقہ کے اندر ہی ہوگا۔ دوسرے فرقہ کا الگ وجود خود اس کی شہادت ہے کہ وہ ان کے کسی فیصلے کو حجتِ شرعی نہیں مانتا۔ اصل یہ ہے کہ جب امّت میں پہلا تفرقہ (شیعہ اور غیر شیعہ)

کا پیدا ہُوا تو شیعہ قلیل تعداد میں تھے (اور ہمیشہ قلیل تعداد میں رہے ہیں) اور سنیوں کی اکثریت تھی پھر جب سنیوں میں مختلف گروہ پیدا ہوئے تو ان میں اہلِ فقہ کی اکثریت تھی۔ ان کی اکثریت ہر دور میں رہی ہے اور آج بھی یہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا قریب ۳/۴ حصہ ہیں۔ اس لئے ان کی طرف سے اس قسم کی احادیث تائیداً پیش کی جاتی ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میری امت کا سوادِ اعظم کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوگا۔ یہی جذبہ درحقیقت اجماع کے سرچشمۂ قانون قرار دیئے جانے کا محرک بھی ہے۔ اس اعتبار سے اجماع امت سے مفہوم ہوگا امت کے گروہِ عظیم کا فیصلہ، یعنی حنفی مسلمانوں کا مسلک۔ یہ ظاہر ہے کہ ان کا ہر فیصلہ (غیر سنی تو ایک طرف خود سنیوں میں بھی) نہ اہلِ حدیث کے نزدیک قانونِ شریعت بن سکتا ہے۔ نہ دیگر ائمہ فقہ۔ امام مالکؒ امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ اور ان کے متبعین کے نزدیک۔

یہ ہے اجماع کا مروجہ مفہوم اور اس کی عملی حیثیت۔

سنّت / حدیث

قیاس اور اجماع کے بعد، قوانینِ شریعت کا تیسرا ماخذ سنت یا حدیث کو قرار دیا جاتا ہے۔ ویسے تو احادیث کے متعلق شروع ہی سے بڑی طول طویل بحثیں چلی آرہی ہیں لیکن ہمارے زمانہ میں (بالخصوص پاکستان میں) اس سوال نے خاص اہمیت حاصل کرلی ہے کیونکہ یہاں یہ عملی سوال سامنے آگیا ہے کہ اسلامی مملکت کی قانون سازی میں حدیث کا مقام کیا ہے۔ اس سوال کا ملت کے سامنے آنا بڑی نیک فال تھا لیکن جیسا کہ آپ نے دیکھا ہے، بجائے اس کے کہ اس کے متعلق خالص علمی اور دینی انداز سے گفتگو کی جاتی، اسے سطحی جذبات میں الجھا دیا گیا اور سرے سے اس سوال ہی کو ملت میں مزید انتشار پیدا کرنے والا فتنہ قرار دے دیا گیا۔ بہرحال اس کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے۔ اس کا ملخص (مختصر الفاظ میں) یہ ہے کہ:-

۱۔ **حدیث**، اسلامی قوانینِ شریعت میں ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو فیصلے احادیث میں آچکے ہیں وہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل ہیں۔ ان میں کسی قسم کا ردّ و بدل نہیں کیا جاسکتا۔

۲۔ بعض حضرات حدیث کے ساتھ سنّت کا لفظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوا کہ کہ سنّت کا مفہوم کیا ہے اور اس میں اور حدیث میں کچھ فرق ہے یا دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ ان میں فرق ہے۔ حدیث ہر اس قول یا فعل کو کہتے ہیں جو رسول اللہؐ کی طرف منسوب ہو اور سنّت حضورؐ کے ثابت شدہ طریقہ کو کہتے ہیں۔ دوسرا کہتا ہے کہ ان میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں مرادف المعنی ہیں۔

۳۔ سنت میں صرف رسول اللہؐ کی سنّت ہی داخل نہیں بلکہ سنتِ خلفائے راشدینؓ بھی شامل ہے۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہُوا کہ خلفائے راشدینؓ میں کون کون شامل ہیں۔ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ ان سے صرف اوّلین چار خلفائے رسول اللہؐ مراد ہیں۔ دوسرے گروہ نے لکھا ہے کہ نہیں! ان میں تمام وہ حکمران شامل ہیں جنہوں نے امّت کو اسلامی طریقہ پر چلایا یا جو آئندہ اسے اسلامی طریق پر چلائینگے۔

۴۔ پھر یہ سوال پیدا ہُوا کہ کیا رسول اللہؐ کا ہر قول یا فعل شرعی حیثیت رکھتا ہے یا ان میں فرق کیا جا سکتا ہے۔ ایک گروہ کا کہنا یہ ہے کہ رسول اللہؐ اپنی رسالت کے پہلے دن سے زندگی کے آخری سانس تک بہر حال اور ہر حیثیت سے رسول تھے اس لئے حضورؐ کا ہر قول یا عمل شرعی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسرے گروہ کا یہ عقیدہ ہے کہ نہیں! رسول اللہؐ نے جو کچھ بہ حیثیت رسول کہا یا فرمایا تھا وہی دینی حیثیت رکھتا ہے جو کچھ آپؐ نے اپنی بشری حیثیت یا تاریخ کے ایک خاص دَور میں عرب کے باشندہ ہونے کی حیثیت سے کہا یا کیا تھا۔ وہ شرعی حیثیت نہیں رکھتا۔

۵۔ اس سے یہ سوالات پیدا ہوئے کہ

(ا) کیا رسول اللہؐ کی سنّت (یعنی آپؐ کا ثابت شدہ طریق) کسی خاص کتاب میں منضبط ہے اور وہ کتاب تمام مسلمانوں کے نزدیک ایسی صحیح اور قابلِ اعتماد ہے کہ اس پر کسی قسم کی تنقید نہیں کی جا سکتی۔

(ب) کیا احادیث کی کوئی ایسی کتاب ہے جس کی ایک ایک حدیث بلا شک و شبہ رسول اللہؐ کی حدیث تسلیم کی جائے۔

(ج) کیا کسی کتاب میں یہ مذکور ہے کہ رسول اللہؐ نے فلاں بات بحیثیت رسول فرمائی تھی اور فلاں بات اپنی عام بشری یا تاریخی فرد ہونے کی حیثیت سے کہی تھی۔

ایک گروہ نے یہ کہا کہ ہاں! ایسی کتاب (یا کتابیں) ہیں جن کی ایک ایک حدیث یقینی طور پر صحیح ہے اور چونکہ رسول اللہؐ کی دو حدیثیں تھی ہی نہیں اس لئے) ہر حدیث رسول ہی کی حیثیت سے ہے۔ لیکن دوسرے گروہ نے کہا کہ نہیں! جسے تم سب سے زیادہ صحیح اور قابلِ اعتماد مجموعہ (یعنی بخاری شریف) بھی قرار دیتے ہو اس میں صحیح اور غلط دونوں قسم کی احادیث موجود ہیں۔ اس لئے اس کی بھی ہر حدیث کو بلا تنقید صحیح تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے یہ سوال پیدا ہُوا کہ

۶۔ صحیح اور غلط حدیثوں کے پرکھنے کا معیار کیا ہے؟ ایک گروہ نے کہا کہ اسلاف ان معیاروں کو مقرر کر چکے ہیں۔ اور ان کے مطابق حدیثوں کی جانچ پرکھ بھی کر چکے ہیں۔ لیکن دوسرے گروہ کا کہنا ہے

کہ ان معیاروں کے علاوہ ایک معیار یہ بھی ہے کہ بعض لوگوں میں اسلام اور سیرتِ نبویؐ کے مطالعہ سے ایسی بصیرت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ رسول اللہؐ کے مزاج شناس ہو جاتے ہیں۔ ان کی نگاہ فوراً بتا دیتی ہے کہ فلاں حدیث صحیح ہے اور فلاں غلط۔ حتیٰ کہ اگر کسی معاملہ میں کوئی حدیث نہ ملے تو بھی وہ بتا سکتا ہے کہ اگر یہ معاملہ رسول اللہؐ کے سامنے پیش ہوتا تو حضورؐ اس کے متعلق یہ فرماتے۔

۷۔ اس آخری بات سے یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا زندگی کے تمام معاملات کے متعلق احادیث میں احکام مل جاتے ہیں یا ایسے معاملات بھی ہو سکتے ہیں جن کے متعلق احادیث میں پہلے سے احکام موجود نہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ احادیث کے ذریعے دین مکمل ہو چکا ہے اب کوئی معاملہ ایسا ہو نہیں سکتا جس کے متعلق پہلے سے فیصلہ موجود نہ ہو لیکن دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ ایسے معاملات ہو سکتے ہیں جن کے لئے پہلے سے فیصلہ موجود نہ ہو، ایسے امور کا فیصلہ اجتہاد سے کیا جائیگا۔

۸۔ یہ سوال بھی اٹھا کہ احادیث میں جو فیصلے مذکور ہیں (خواہ انہیں بالکل صحیح بھی کیوں نہ تسلیم کر لیا جائے) کیا وہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے یا ان میں بہ تقاضائے حالات ردّ و بدل کیا جا سکتا ہے۔ ایک گروہ نے یہ کہا کہ ان میں کسی قسم کا ردّ و بدل نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن دوسرے گروہ کا کہنا ہے کہ نہیں! ان میں ایسے فیصلے بھی ہو سکتے ہیں جن میں تغیرِ حالات سے ردّ و بدل کیا جا سکتا ہے۔

یہ ہے مختصر طور پر خلاصہ ان مباحث کا جو حدیث کے متعلق ہمارے سامنے آ چکے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ تمام باہمد گر مختلف خیالات، جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے ان حضرات کے ہیں جو اپنے آپ کو حدیث کے ماننے والے کہتے ہیں۔ ان میں وہ لوگ شامل نہیں جنھیں "منکرین حدیث" کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ان تمام متضاد خیالات کے ماننے والے (جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے) حدیث ماننے والے تسلیم کئے جاتے ہیں تو "منکرینِ حدیث" صرف وہ لوگ رہ جائیں گے جن کا عقیدہ یہ ہے کہ زندگی کے تمام معاملات کے متعلق تفصیلی فیصلے قرآنِ کریم کے اندر موجود ہیں۔ اس لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کہ فلاں معاملہ کے متعلق رسول اللہؐ نے کیا فیصلہ فرمایا تھا۔ یہ گروہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جو اپنے آپ کو "اہلِ قرآن" کہتے ہیں۔ (یعنی ان اصطلاحی معنوں میں اہلِ قرآن، ورنہ عام معنوں میں اہلِ قرآن تو ہر مسلمان ہے۔)

یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ حدیث کے متعلق یہ بحثیں ہمارے زمانہ کی پیدا کردہ نہیں۔ یہ بہت پہلے سے چلی آ رہی ہیں۔ حتیٰ کہ امام شافعیؒ (پیدائش ۱۵۰ھ، وفات ۲۰۴ھ) نے اپنی مشہور کتاب (کتاب الام) میں ایک گروہ سے اپنے ایک مناظرے کی رُوداد لکھی ہے۔ جنھیں وہ منکرینِ حدیث کہتے ہیں۔

نیز یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ گزشتہ صفحات میں جن مختلف گروہوں کا میں نے ذکر کیا ہے۔ یہ اہل سنت والجماعت کے مختلف الخیال گروہ ہیں جو جمہور مسلمان کہلاتے ہیں۔ ان میں مخصوص معتقدات کے فرقے مثلاً اہل تشیعہ وغیرہ شامل نہیں۔

حدیث کے متعلق جو مباحث آپ کے سامنے آچکے ہیں۔ ان سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ اس عقیدہ کو محض نظری طور پر متفقہ علیہ کہا جاسکتا ہے کہ حدیث قوانینِ شریعت کا ماخذ ہے۔ ورنہ عملاً آج تک متفقہ طور پر متعین ہی نہیں ہو سکا کہ کونسی احادیث قوانینِ شریعت کا ماخذ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان حضرات سے یہ سوال کیا جائے تو یہ اس کے متعین، واضح اور قطعی جواب سے ہمیشہ پہلوتہی کرتے ہیں اور "کتاب وسنّت" کی غیر متعین اصطلاح سے آگے نہیں بڑھتے اس لئے کہ جو تصریح ایک گروہ پیش کرے گا وہ دوسرے کے قریب قابلِ قبول نہیں ہوگی۔ آج تک تو یہ معاملہ مساجد اور مدارس کی چار دیواری تک محدود تھا۔ اس لئے کہ وہاں ہر گروہ اپنے اپنے مسلک کو حق قرار دیتا اور اس کی تبلیغ کرتا تھا۔ لیکن اب جب یہ سوال سامنے آیا کہ "ملک کا کوئی قانون کتاب وسنّت کے خلاف نہیں ہوگا" تو لازماً یہ سوال بھی سامنے آنا چاہیئے تھا کہ سنّت سے مراد کیا ہے۔ اس کے لئے دشواری یہ تھی کہ اس کا جو جواب ایک گروہ دے وہ دوسرے گروہ کے نزدیک قابلِ قبول نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لیئے مصلحت اسی میں سمجھی گئی کہ اس کا جواب ہی نہ دیا جائے۔ لیکن سوچیئے کہ عملی دنیا میں کسی سوال کے جواب سے چشم پوشی کرنے سے کیسے کام چل سکتا ہے؟ اس سوال کا تعلق مملکت کی قانون سازی سے ہے۔ شخصی معاملات کی حد تک تو یہ کر لیا گیا ہے کہ کتاب وسنّت کی وہی تعبیر صحیح تسلیم کی جائے گی جو اس فرقے کے نزدیک قابلِ قبول ہوگی۔ لیکن جس معاملہ کا تعلق پورے ملک سے ہوگا اس میں تو "کتاب وسنّت" کی ایک ہی تعبیر قابلِ عمل ہوگی۔ سوچیئے کہ اس مقام پر کیا ہوگا؟

قرآن

قوانینِ شریعت کا چوتھا اور آخری ماخذ قرآنِ کریم ہے۔ آپ یہ کہتے ہوں گے کہ کم از کم قرآن کی حد تک تو تمام مسلمان (یعنی کم از کم سنی مسلمان متفق ہونگے۔ لیکن واقعتہً ایسا نہیں۔ ہماری بدقسمتی کی حد یہ ہے کہ ہمارے ہاں کتاب اللہ بھی اختلافی عقائد سے بلند نہیں رہی۔ یہ اختلافات مختصر الفاظ میں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ قرآن میں بہت سی آیات ایسی ہیں جن کا حکم منسوخ ہے۔ انھیں ثواب کی خاطر پڑھا جاتا ہے۔ لیکن دوسرے گروہ کا یہ عقیدہ ہے کہ اس میں کوئی آیت منسوخ نہیں ہے

آیت اپنے مقام پر واجب العمل ہے۔

۲۔ ایک گروہ کا عقیدہ ہے کہ ایسی آیات بھی ہیں جن پر عمل تو ہوتا ہے۔ لیکن وہ قرآن کے اندر موجود نہیں دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اس قسم کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

۳۔ ایک گروہ کا عقیدہ ہے کہ قرآن اور حدیث دونوں وحی پر مبنی ہیں۔ حدیث قرآن کے مجمل احکام کی تفصیل بیان کرتی ہے۔ دوسرے گروہ کا یہ کہنا ہے کہ وحی صرف قرآن کے اندر ہے۔ احادیث رسول اللہؐ کی خود متعین فرمودہ تفاصیل ہیں۔

۴۔ ایک گروہ کا عقیدہ ہے کہ احادیث قرآنی آیات کو منسوخ کر سکتی ہیں۔ اس لئے کہ احادیث بھی قرآن کی طرح وحی پر مبنی ہیں۔ اسی طرح اگر کسی معاملہ میں قرآن اور حدیث میں تضاد نظر آئے تو حدیث کے فیصلہ کو ترجیح دی جائے گی۔ لیکن دوسرا گروہ اس عقیدہ کو صحیح نہیں سمجھتا۔

۵۔ احکام کے علاوہ قرآن کی دیگر آیات کے متعلق بھی ایک گروہ کا عقیدہ ہے کہ ان کا جو مفہوم روایات میں بیان ہوا ہے وہی مفہوم صحیح اور حرفِ آخر ہے۔ اس سے کوئی الگ مفہوم لیا ہی نہیں جا سکتا۔ لیکن دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ جوں جوں زمانہ علم و انکشافات میں آگے بڑھتا جائے گا۔ قرآن کے معانی کھلتے چلے جائیں گے۔ اس لئے اس میں ہر زمانہ میں تفکر و تدبر کی ضرورت ہے۔

۶۔ ایک گروہ کا یہ عقیدہ ہے کہ قرآنی احکام کی جو تفاصیل فقہ کی کتابوں میں آچکی ہیں، وہی تفاصیل قابلِ قبول اور قیامت تک کے لئے واجب العمل ہیں، دوسرا گروہ اس عقیدے سے اختلاف رکھتا ہے۔

۷۔ چونکہ "اہلِ قرآن" کا ذکر پہلے آچکا ہے اس لئے ان کے اس عقیدہ کا دُہرا دینا بھی ضروری ہے کہ تمام معاملات کی جملہ تفاصیل قرآن کے اندر آچکی ہیں۔ اس لئے قرآنی احکام کی تفاصیل کیلئے کسی اور طرف رجوع کرنا صحیح نہیں۔

عقیدہ کہ "قرآن قوانینِ شریعت کا ماخذ ہے" جب عملی آئینہ میں دیکھا جائے تو اس کی حیثیت کیا ہے۔؟

تعالیٰ نے انسان کو عقل دی ہے جس سے وہ زندگی کے معاملات کے فیصلے کرتا ہے۔ دو انسانوں کے مفاد میں تصادم ہوتا ہے تو ہر ایک کی عقل اپنے حق میں فیصلہ دیتی ہے افراد سے بڑھ کر دو گروہوں میں، اور پھر دو قوموں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اور قوموں سے اقوام کے مخالف جتھوں میں۔ اس قسم کے معاملات کے تصفیہ کے لئے اور یہ بتانے کیلئے

کہ انسانی زندگی کا مقصود و منتہیٰ اور اس کا نصب العین کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے راہنمائی دی ہے۔ یہ راہنمائی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ اور اس سے باہر اور کہیں نہیں قرآن کریم کی راہنمائی چونکہ تمام دنیا کے انسانوں کے لئے اور تمام زمانوں کے لئے ہے۔ اس لئے اس میں (چند مستثنیات کو چھوڑ کر) صرف اصول بیان کئے گئے ہیں، تاکہ ہر دور کے انسان، اپنے اپنے زمانے کی ضرورتوں کے لحاظ سے ان اصولوں کی روشنی میں اپنے مسائل کا حل خود متعین کرتے رہیں۔

ان جزئیات کے متعین کرنے کے طریق کے متعلق بھی قرآن نے راہنمائی دے دی ہے۔ اور وہ یہ کہ امت باہمی مشورہ سے اس اہم فریضہ کو سرانجام دے۔ اس طریق پر سب سے پہلے رسول اللہؐ نے عمل فرمایا (واضح رہے کہ قرآن نے رسول اللہ کو خصوصیت سے اس کی تاکید کی تھی) حضورؐ کے بعد آپؐ کے خلفاء (جانشینوں) نے ایسا ہی کیا۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ رسول اللہؐ نے قرآن کے اصولوں کے مطابق ایک حکومت قائم کی تھی اور یہی حکومت آپؐ کے جانشینوں کی طرف منتقل ہوئی تھی۔ اس تصور کے مطابق یہ حقیقت تمہاری سمجھ میں آجائے گی کہ کوئی حکومت اپنی پیشرو حکومت کی سنّت (طرزِ عمل) سے مستغنی ہو نہیں سکتی۔ جب کوئی حکومت مسلسل قائم رہے تو سابقہ حکومتوں کے فیصلے آنیوالی حکومتوں میں مسلسل نافذ العمل رہتے ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ ہر نیا حاکم، سابقہ حاکم کے فیصلوں کو منسوخ کر کے تمام احکام از سرِ نو جاری کر دے۔ ایک نئی حکومت جو سابقہ حکومت کا تختہ الٹ کر قائم ہو، اس طرح کرتی ہے۔ لیکن ایک ہی انداز کی حکومت سابقہ فیصلوں کو علی حالہٖ قائم رکھتی ہے۔ تاوقتیکہ ان میں کسی تبدیلی کی ضرورت پڑ جائے۔ اس وقت وہ اس میں مناسب تبدیلی کر دیتی ہے۔ بعینہٖ یہی انداز ہے جسے ہم رسول اللہؐ کے خلفاء کے زمانے میں دیکھتے ہیں۔ جب حضرت ابوبکر صدیق رضؓ حضورؐ کے جانشین (خلیفہ) مقرر ہوئے تو آپ نے اعلان کیا کہ میں قرآن کریم اور سنت رسول اللہؐ کی اتباع کروں گا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ میں کسی نئی حکومت کی طرح نہیں ڈال رہا۔ میری حکومت سابقہ حکومت ہی کا تسلسل ہے۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں سنتِ رسولؐ اللہ اور سنتِ حضرت ابوبکرؓ کی اتباع کروں گا۔ اس سے بھی مقصود وہی تھا۔

اس حد تک تو بات صاف ہے۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان حضرات کو اگر کسی سابقہ فیصلے میں تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی تو کیا انھوں نے ایسی تبدیلی کی؟ تاریخ میں ہمیں متعدد واقعات ایسے ملتے ہیں جن میں حضرت عمرؓ نے عہد رسالت مآبؐ کے فیصلوں میں اور عہدِ صدیقیؓ کے فیصلوں میں ضروری تبدیلیاں کیں۔ اس طرح یہ سلسلہ ماضی سے وابستہ بھی رہا اور زمانے کے بدلتے ہوئے

تقاضوں کا ساتھ بھی دیتا چلا گیا۔ کوئی قوم جو تسلسلِ حیات چاہتی ہے۔ اپنے ماضی سے اپنے آپ کو یکسر منقطع کر نہیں سکتی لیکن ماضی سے وابستہ رہنا اور بات ہے اور ماضی کی زنجیروں میں جکڑے رہنا اور بات۔ ماضی سے وابستہ رہنے کا مفہوم یہ ہے کہ ہم اپنے سابقہ ادوار کے تجربوں سے مستفید ہوتے رہیں۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ جہاں زمانے کے تقاضے کسی تبدیلی کے متقاضی ہوں وہ تبدیلی بھی روا نہ رکھی جائے۔ غیر متبدل صرف وہ راہنمائی ہے جسے خدا نے ہمیشہ کے لئے اور تمام نوعِ انسان کے لئے شمع راہ بنایا ہے۔ اس راہنمائی کا مقصود یہ ہے کہ انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کر کے انہیں تکمیل تک پہنچایا جائے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ انہیں مواقع بہم پہنچائے جائیں تاکہ وہ علم و بصیرت اور غور و تدبر سے زمانہ کے بڑھتے اور بدلتے ہوئے تقاضوں کا حل تلاش کریں۔ اگر انہیں زندگی کے ہر مسئلہ کے متعلق بنے بنائے قوانین دے دیئے جائیں اور انہیں قیامت تک کے لئے غیر متبدل قرار دے دیا جائے تو انہیں اپنی فکری صلاحیتوں کی نشوونما کا موقع کہاں ملے گا؟ نبوت کا دروازہ بند کرنے سے مقصد ہی یہ تھا کہ ذہنِ انسانی کی کھڑکیاں کھول دی جائیں۔

ان تصریحات کی روشنی میں ایک مرتبہ پھر اس نقشہ کو سامنے لائیں جس کے مطابق عہدِ رسالتمآبؐ اور عہدِ خلفائے راشدینؓ میں معاملاتِ زندگی کے متعلق فیصلے مرتب اور صادر ہوتے تھے اس نقشہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ

۱۔ رسول اللہؐ کے زمانے میں جب کوئی معاملہ پیش ہوتا تو یہ دیکھا جاتا کہ قرآن کریم نے اس کے متعلق کیا ہدایت دی ہے۔ اس ہدایت کی روشنی میں حضورؐ اپنے صحابہؓ کے مشورے سے معاملہ کی جزئیات طے فرماتے۔

۲۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ میں جب کوئی معاملہ پیش ہوتا تو دیکھا جاتا کہ حضورؐ کے زمانہ میں اس کے متعلق کوئی فیصلہ ہوا تھا۔ اگر کوئی فیصلہ موجود ہوتا تو اسے اختیار کر لیا جاتا، ورنہ طریقِ بالا کے مطابق اس کی جزئیات خود طے کر لی جاتیں۔ اس کا نام اتباعِ کتاب و سنت تھا۔

۳۔ یہی انداز حضرت عمرؓ کے زمانہ میں رہا۔ اس میں رسول اللہؐ اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانے کے فیصلوں کی طرف رجوع کیا جاتا۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اسلامی فتوحات کا سلسلہ بڑھا۔ دوسری قوموں سے ربط و ضبط پیدا ہوا۔ معاملات کی نوعیت بدل گئی۔ بعض حالات میں تغیر واقع ہو گیا۔ اس لئے آپ کو بکثرت نئے فیصلے بھی کرنے پڑے اور کئی ایک سابقہ فیصلوں میں ترمیمات بھی کرنا پڑیں۔

اس اندازِ حکومت میں قرآن، سنت، اجماع اور قیاس چاروں اپنے اپنے مقام پر آجاتے ہیں۔ کتاب

اللہ کی اصولی راہنمائی۔ سابقہ حکومت کے فیصلے (سنّت) ان کی روشنی میں نئے معاملات کے لئے از روئے قیاس نئے فیصلے یا سابقہ فیصلوں میں تبدیلی اور مشاورتی نظام کے ماتحت ان فیصلوں کا اجراء (اجماع) یہ تھا اس وقت صحیح مفہوم کتاب وسنّت اجماع اور قیاس کا۔

جب ایک انداز کی حکومت مسلسل آگے چلتی جائے۔ تو اس میں سابقہ فیصلوں سے مستغنی ہُوا ہی نہیں جاسکتا۔ اس میں سابقہ فیصلے بھی ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ان میں نئے فیصلوں کا اضافہ بھی ہوتا جاتا ہے۔ اور عند الضرورت سابقہ فیصلوں میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ اگر خلافت علیٰ منہاجِ نبوّت کا سلسلہ بدستور جاری رہتا تو حکومت کا یہی نقشہ آگے بڑھتا چلا جاتا۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہُوا۔ اس کے بعد مسلمانوں کی حکومت تو آگے چلی لیکن اس کا انداز مختلف ہوگیا۔ یہی انداز مختلف اسلامی ممالک میں اس وقت تک چلا جا رہا ہے۔ اب اگر کسی خطۂ زمین کے مسلمان چاہیں کہ اپنے ہاں اسی پہلے انداز کی حکومت (خلافت علیٰ منہاجِ نبوّت) قائم کریں تو ان کے ہاں قانون سازی کی وہی صورت پیدا ہوجائے گی جو اس زمانہ میں تھی۔ اس میں کتاب اللہ کی راہنمائی کو مستقلاً سامنے رکھا جائے گا۔ پھر یہ دیکھا جائے گا کہ معاملہ پیشِ نظر کے لئے سابقہ دَور کے تاریخی نوشتوں میں کوئی نظائر (PRECEDENTS) ملتے ہیں یا نہیں اگر ملتے ہوں اور زمانہ کے اتنے بعد کے باوجود ان میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہ ہو تو انہیں علیٰ حالہٖ اختیار (ADOPT) کرلیا جائے گا۔ اگر ان میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوگی تو تغیّر حالات پر قیاس کرکے مناسب تبدیلی سے اسے (ADOPT) کرلیا جائے گا یا عند الضرورت کوئی نیا فیصلہ کرلیا جائیگا اور جب اس فیصلہ کو مرکزِ ملّت (نظام یا حکومت) کی طرف سے نافذ کیا جائے گا تو اس پر سب کا اجماع بھی ہوگا۔ یہ عملی مفہوم ہوگا۔ کتاب، سنّت، اجماع اور قیاس کا۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ نہ کسی قسم کی کوئی اُلجھن پیش آتی ہے نہ سلوٹ۔ نہ فرقہ بندی کی گنجائش رہتی ہے نہ مختلف فقہی مذاہب کی ضرورت سب کی راہنمائی کے لئے ایک کتاب۔ نمائندگانِ ملّت پر مشتمل ایک پارلیمان جو قیاس اور اجتہاد کے فرائض سرانجام دے۔ اس نظام کے مرکز کی طرف سے جاری شدہ فیصلے سب کے لئے واجب التسلیم! ثبات وتغیّر کے اس حسین امتزاج کو لئے ہوئے اسلامی نظامِ امّت کا، رواں دواں آگے بڑھتے جانا۔

جہاں تک قانونِ شریعت کے مآخذ کا تعلق ہے۔ اس کا درحقیقت مآخذ ایک ہی ہے یعنی کتاب اللہ باقی تینوں شقیں دراصل قانون کی تدوین یا تنفیذ کے طریقے ہیں کتاب اللہ کی روشنی میں کئے ہوئے سابقہ فیصلوں کو علی نافذ کردینا اتباعِ سنت کہلائے گا۔ نئے معاملات پر غور وخوض کرنا اجتہاد یا قیاس ہوگا اور امّت کے مشورے سے فیصلوں تک پہنچنا اور انہیں نافذ کرنا اجماع کہلائے گا۔ لہٰذا اسلامی قانونِ شریعت کا خذ صرف قرآن ہے اور یہی مفہوم ہے جسنا کتاب اللہ

پرویزؒ صاحب کی کتاب فردوسِ گم گشتہ سے ماخوذ

جنگ؟

انسان بھی اک طُرفہ تماشا ہے!

اسے عبادت گاہوں میں سر جھکائے دیکھو تو آسمان کے فرشتے اس کی شانِ عبودیت پر نثار ہوتے ہیں۔ اس کی خاک آلود پیشانی پر سطوت و ثروت کے ہزار طرہ ہائے کہکشاں گیر قربان ہوتے ہیں۔ اس کے ذوقِ جبیں سائی پر جاہ و جلال کی لاکھوں غلغلہ اندازیاں اور شوکت و حشمت کی کروڑوں طنطنہ خیزیاں تصدق ہوتی ہیں۔ اس کی جھکی ہوئی نگاہوں کے سامنے حوروں کی معصومیت ہیچ اور اس کے قطراتِ انفعال کے مقابل کوثر و تسنیم کی گہرباریاں ناقابلِ التفات۔ اس کا ایک ایک سجدہ زمین و آسمان کو وجد میں لاتا ہے اور اس کے جذبۂ تعبد و تذلل کی شانِ رعنائی پکار پکار کر کہہ رہی ہوتی ہے کہ

ترے سنگِ در نے بدل دیا ہے، یہ پستیوں کو فراز میں
کہ ہزاروں عرش جھلک رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

اور اگر اسے محبت کے حریمِ قدس میں دیکھو تو کسی کی یاد میں اس کے ڈھلکتے ہوئے آنسوؤں کو چاند اپنے بلوریں کٹورے میں بھر لیتا ہے کہ وہ ظلمتکدۂ عالم میں شمع کافوری کا کام دیں۔ آفتاب اس کی آتشِ پنہاں سے کچھ حرارت مستعار لیتا ہے کہ اس سے نبضِ ہستی میں تموّج پیدا کرے۔ کائنات کا ذرّہ ذرّہ اس کی تپش و خلش اور سوز و گداز سے اپنے اندر زندگی محسوس کرتا ہے۔ اس کی آہِ سحرگاہی اور نالۂ نیم شبی اس حقیقت کے آئینہ دار ہوتے ہیں کہ

عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات
عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات

اور اگر اسے حیرت خانۂ علوم و فنون میں جلوہ بار دیکھو تو اس کا فکرِ فلک پیما زمین کی پستیوں سے آسمان کی بلندیوں تک کے راز فاش کرتا ہے۔ مہر و مہ و ستارہ سب اس کی کمندِ تخیل کے اسیر ہوتے ہیں۔ وہ زہر سے تریاق بناتا ہے جو نوعِ انسانی کے ہلاکت انگیز ناسور کے لئے مرہم جاں بخش کا کام دیتا ہے۔ اس کے فنونِ لطیفہ کی اختراعاتِ جمیلہ اس ہار و یاس مجلس آب و گل کو جذبات و احساسات کی حسین جنت میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اس کی صنعتی گلکاریاں، تہذیب و تمدّن کے قصرِ بلند میں نور و نکہت

کے سامان ارزاں کرتی ہیں۔ وہ ان نوادرات کی متاعِ گراں بہا کے پیشِ نظر خالقِ کائنات کے سامنے بجا طور پر فخر کرتا ہے کہ

تو شب آفریدی چراغ آفریدیم — سفال آفریدی، ایاغ آفریدیم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی — خیابان و گلزار و باغ آفریدیم

مَن آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
مَن آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

لیکن یہی انسان جب جذبۂ انتقام و ہوسِ خون آشامی سے مغلوب ہو کر اپنے ہی جیسے انسانوں کے خلاف غم و غصہ میں بھرا ہوا اٹھتا ہے تو عبودیت کا عجز و انکسار، محبت کا سوز و گداز اور علم و حکمت کا نورِ بصیرت، سب ایک ایک کر کے الگ ہو جاتے ہیں اور اس کی خوفناک سبعیت و بربریت وحشی سے وحشی درندوں سے بھی آگے بڑھ جاتی ہے۔ یہ ایک آتش بار اژدہا کی طرح پھنکارتا اور ایک ہیبت ناک شیر کی طرح گرجتا اٹھتا ہے اور تہذیب و تمدن، عقل و ہوش علم و بصیرت عدل و انصاف رحم و کرم۔ غرضیکہ جوہرِ انسانیت کی ایک ایک خصوصیت کو کچلتا، روندتا، طوفانِ بلا کی طرح آگے بڑھتا اور ایک بھیانک عفریت کی طرح اپنا آہنی پنجۂ استبداد فریقِ مقابل کے سینے میں گاڑ دیتا ہے اور اپنے دندانِ حرص و آز کو اس کی رگِ جاں میں پیوست کر کے اس کے چشمۂ حیات سے اپنی ہوسِ خون آشامی کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ اس غیظ و غضب کے عالم میں وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتا ہے۔ وہ اپنی قوت کے نشہ میں اس قدر بدمست ہو جاتا ہے کہ کوئی معقول بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ دلیل و برہان کا جواب تیغ و سناں سے دینا چاہتا ہے۔ وہ باہمی افہام و تفہیم سے معاملات سلجھانے کی بجائے، فریقِ مخالف کو توپ و تفنگ سے دھمکا کر اپنی بات ماننے پر مجبور کرنا چاہتا ہے۔ وہ کسی کے مشورے کو خاطر میں نہیں لاتا، کسی کی ثالثی پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس کی ان حرکات پر عقل ہنستی ہے، خرد ماتم کرتی ہے، شرافت شرماتی ہے، انسانیت مارے ندامت کے ڈوبتی چلی جاتی ہے لیکن اسے ان میں سے کسی کا بھی احساس نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ عقل و خرد اور شرافت و انسانیت جن جذبات کو اپیل کر سکتی ہے وہ ان سے عاری ہو چکا ہوتا ہے۔ یا یوں کہیئے کہ وہ جذبات، قوت کی پرستیوں کے نیچے اسی طرح دب جاتے ہیں جس طرح شراب کے نشے سے انسان کے ہوش و حواس پر پردہ پڑ جاتا ہے (کہ خمر کے معنی ہی ڈھانپنے والی شئے کے ہیں)۔

سوال یہ ہے کہ کیا ایسے انسان کو ان حالات میں آزاد چھوڑ دیا جائے کہ جو اس کے جی میں آئے

کرے؟ ہمارا خیال ہے کہ دنیا کا بدسے بدتر انسان بھی یہ نہیں کہے گا کہ ہاں! ایسے انسان نما درندے کو کھلا چھوڑ دینا چاہیئے کہ وہ نیستانِ ہستی میں اپنے فتنہ و فساد کی چنگاریاں پھینکتا پھرے اور اس طرح امنِ عالم اور فلاحِ انسانیت کو پھونک کر راکھ کا ڈھیر بنا دے۔ انسانی معاشرے کے آئین و ضوابط نے ایسے انسان کے لئے انتظام کر رکھا ہے۔ اگر وہ طبعی طور پر فاتر العقل ہو چکا ہے تو اسے پاگل خانے میں بھیج دیا جاتا ہے اور اگر اس کی عقل و خرد ہی اسے ان فساد انگیزیوں پر ابھارتی ہے تو اسے لوہے کی سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا جاتا ہے تاکہ نوعِ انسانی اس کے دندانِ حرص و آز اور ناخنِ جور و استبداد سے محفوظ رہ سکے۔ پولیس اور عدالت اسی مقصد کے لئے ہوتی ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اگر ایک فرد کے بجائے ایک قوم (یا مملکت) اس طرح عقلی توازن کھو بیٹھے اور اپنی حقیقی یا مزعومہ قوت کے نشہ میں کسی دوسری قوم یا مملکت کے جائز حقوق کو غصب کرنا چاہے اور اسے جینے تک کا حق نہ دے تو اس کا کیا علاج کیا جائے!

اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس سے وہ قوت چھین لی جائے جو اس کی ان بدمستیوں اور فتنہ انگیزیوں کا باعث بن رہی ہے۔ لیکن قوت بغیر قوت کے چھینی نہیں جا سکتی۔ ان حالات میں قوت کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔ دونوں قوتوں کے اس تصادم کا نام جنگ ہے۔ قوتیں دونوں طرف ہیں، لیکن غور کیجئے کہ ایک قوت کس مقصد میں صرف ہو رہی ہے اور دوسری قوت کس مطلب کیلئے! یہی وہ مقام ہے جہاں قرآن جنگ کی اجازت ہی نہیں دیتا بلکہ حکم دیتا ہے۔

قرآن کے نزدیک انسانی زندگی بیش بہا متاع ہے جس کی حفاظت نہائت ضروری ہے۔ وہ اس حفاظت کو کس قدر اہمیت دیتا ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا:

من قتل نفسا بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعا (۵/۳۲)

جس نے کسی جان کو قتل کر ڈالا۔ سوا اس حالت کے کہ قصاص لینا ہو یا ملک میں فساد برپا کرنے والوں کو سزا دینی ہو، تو یوں سمجھو گویا اس نے تمام نوعِ انسانی کو قتل کر ڈالا

لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کرتا کہ جب کوئی انسان یا انسانوں کا گروہ (جسے قوم یا مملکت کہا جاتا ہے) وحشت اور درندگی کے اس مقام تک جا پہنچے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، اور اس کی اصلاح کی کوئی صورت باقی نہ رہے تو نوعِ انسانی کی بہبود کی کے لئے اس انسانیت کے مجرم انسان قوم کے خلاف قوت استعمال کرنا اسی طرح (طوعاً و کرہاً) ناگزیر ہو جاتا ہے جس طرح جب کسی انگلی کا ناسور

یکسر لاعلاج ہو جائے اور اس کا زہر باقی حصۂ جسم کو بھی موت کی طرف لئے جا رہا ہو۔ تو باقی جسم کو اس زہر سے بچانے کے لئے اس زہر آلود انگلی کا کاٹ کر الگ کر دینا۔ نہ صرف جائز بلکہ جسم کی بہبودِ کلّی کے لئے لاینفک ہو جاتا ہے۔ اگر اس وقت ایسا نہ کیا جائے تو کچھ وقت کے بعد پورے کا پورا جسم مسموم ہو کر قبر میں جا پہنچے گا اور اس کے ساتھ وہ انگلی بھی ختم ہو جائے گی جسے کاٹ کر الگ نہیں کیا گیا تھا۔ یعنی پہلے تو صرف ناکارہ انگلی ہی نے ختم ہونا تھا لیکن اب انگلی کے ساتھ پورا جسم بھی تباہ ہو گیا۔

انسانی معاشرے کو اس قسم کے زہر سے متأثر کرنے کا نام قرآن کی اصطلاح میں "فتنہ و فساد" ہے جسے وہ (انگلی اور جسم والی مثال کے مطابق) قتل سے بھی زیادہ نقصان رساں اور تباہ کن قرار دیتا ہے اس لئے اس کا ارشاد ہے کہ الفتنۃ اشد من القتل۔ یعنی فتنہ و فساد جنگ سے بھی زیادہ تباہ کن ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ فتنہ و فساد کے استیصال کے لئے قوت کا استعمال ناگزیر سمجھتا ہے یعنی فتنہ برپا کر دینے والی قوت کو زیر کرنے کے لئے قوت کا استعمال، تاکہ انسانی معاشرہ اس کی شر انگیزیوں سے محفوظ رہے۔ غور کیجئے! قرآن نے اس حقیقت کو کیسے جامع اور بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ قوت صرف اس وقت تک استعمال کرنی چاہیئے جب تک وہ شر انگیز اور فتنہ پرور قوت سپر انداز نہ ہو جائے حتی تضع الحرب اوزارھا (۴۷/۴) یہاں تک کہ خود جنگ اپنے ہتھیاروں کو پھینک دے۔ یعنی جس مقصد کے لئے یہ جنگ ناگزیر ہوگئی تھی وہ مقصد حاصل ہو جائے اور انسانی معاشرہ سرکش قوتوں کی فساد انگیزیوں سے محفوظ ہو جائے۔ چونکہ اس تادیبی عمل میں کسی انتقام یا غصے کو دخل نہیں ہوتا بلکہ یہ کاروائی ایک ڈاکٹر کے اپریشن کی سی ہوتی ہے اس لئے ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ جونہی اس سرکش قوت کے متعلق دیکھو کہ وہ اپنی قہرمانیت و فرعونیت کو چھوڑ کر آمادۂ تسلیم و رضا ہو رہی ہے، اسے فوراً اپنے دامنِ عافیت میں لے لو۔ وان جنحوا للسلم فاجنح لھا۔ اس کی تادیبی کاروائی کے دوران میں بھی نگاہ اس مقصد کی طرف رہے جس خاطر یہ ناگزیر قدم اٹھایا گیا ہے۔ یعنی اندھی قوت کی سرکشی کو درست کرنے کی طرف۔ اسی لئے نبی اکرم ایسے مواقع پر ہمیشہ تاکید فرمایا کرتے تھے کہ کسی بوڑھے کو، بچے کو اور عورت کو قتل نہ کرو (ابوداؤد اسی طرح غیر محارب (CIVIL) آبادی کو ناحق تنگ کرنے کی بھی ممانعت فرما دی۔ ابوداؤد میں حضرت انس جہنی رضؓ سے روائت ہے کہ میں کسی غزوہ میں حضورؐ کے ساتھ تھا۔ لشکریوں نے فریقِ مخالف پڑاؤ پر جا کر انہیں تنگ کیا۔ لوٹا مارا۔ حضورؐ نے فوراً منادی کرا دی کہ جو شخص غیر محارب آبادی کے گھ میں گھس کر انہیں تنگ کرے یا لوٹ مار کرے اس کا جہاد قبول نہیں۔ اس طرح کی لوٹ کھسو

مال بھی ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ ابو داؤد میں ایک انصاری کا بیان ہے کہ ہم حضورؐ کے ساتھ ایک سفر میں شریک تھے۔ لوگوں کو بھوک نے ستایا تو انہوں نے کچھ بکریاں لوٹ کر انہیں ذبح کر لیا اور گوشت کی ہانڈیاں چڑھا دیں۔ حضورؐ کو خبر ملی تو آپ تشریف لائے اور جو کمان ہاتھ میں تھی اس سے سب ہانڈیاں الٹ دیں اور فرمایا کہ لوٹ کی چیز مردار سے بھی زیادہ حرام ہے۔ اسی طرح دشمن کے قاصدوں سے کبھی بدسلوکی نہیں کی جاتی تھی۔ اسیرانِ جنگ سے اپنے عزیز مہمانوں کا سا سلوک کیا جاتا تھا۔ جب حضورؐ نے اسیرانِ بدر کو صحابہؓ کے حوالے کیا ہے تو تاکید فرما دی کہ انہیں کھانے پینے کی تکلیف نہ ہونے پائے چنانچہ صحابہؓ خود تو کھجوروں پر گذارہ کرتے تھے اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے تھے۔ اسیرانِ جنگ کے علاوہ دشمن کا جو آدمی مسلمانوں سے پناہ طلب کرے اس کی پوری پوری حفاظت کی جاتی تھی۔ یہ سب اس لئے کہ جنگ سے مقصود انتقام جوئی یا ہوسِ خون آشامی یا جوع الارض کی تسکین نہ تھی بلکہ انسانی معاشرے میں آئینِ عدل و احسان کا قیام تھا۔ اس حقیقت کو حضورؐ نے نہایت جامع الفاظ میں بیان فرمایا تھا۔ جب حضورؐ سے دریافت کیا گیا کہ کوئی شخص غنیمت کے لئے، کوئی نام کے لئے، کوئی اظہارِ شجاعت کے لئے جہاد کرتا ہے۔ کس کا جہاد راہِ خدا میں سمجھا جائے گا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ: من قاتل لتکون کلمة اللہ العلیا۔ جو شخص اس لئے لڑتا ہے کہ خدا کا قانون غالب رہے اس کا لڑنا جہاد ہے۔ اسی کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ویکون الدین کلہ للہ۔

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ قوت کے استعمال کی نوبت اس وقت آئے گی جب باہمی افہام و تفہیم کے ذریعے تصفیہ معاملات اور اصلاحِ حال کی تمام کوششیں ناکام رہ جائیں۔ سوال یہ ہے کہ جب دو افراد کے درمیان جھگڑا یا اختلاف ہو تو عدالت ایک حکم (ثالث) کی حیثیت سے فیصلہ دے دیتی ہے جس سے وہ جھگڑا طے ہو جاتا ہے۔ لیکن جب یہ جھگڑا یا اختلاف دو قوموں کے درمیان ہو تو اس وقت کیا کیا جائے؟

قرآن نے اس ضرورت کو بھی سمجھ لیا تھا اس لئے اس کا حل بھی بتا دیا تھا۔ اس نے کہا کہ دنیا میں کسی ایسی جماعت کا وجود نہایت ضروری ہے جو تمام اقوامِ عالم کی نقل و حرکت اور اعمال و کردار کا محاسبہ کرتی رہے اور اختلافی مواقع پر باہمی طے شدہ آئین و ضوابط کے مطابق فیصلے کرے اور ان کی خلاف ورزی کے اقدامات کو روکے (تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر) قرآن نے اس جماعت کا نام امتِ مسلمہ رکھا تھا یعنی دنیا میں امن و سلامتی کی ضامن جماعت اور

اس کی خصوصیت یہ بتائی تھی کہ وہ اپنے اس فریضۂ محاسبہ اعمالِ امم میں اس انداز سے جادۂ حق و عدل پر قائم رہے گی کہ دنیا کی ہر قوم اس سے برابر کے فاصلے پر (EQUIDISTANT) ہوگی۔ اس خصوصیت کی حامل قوم کو عربی الفاظ میں امتِ وسطیٰ کہتے ہیں۔ چنانچہ اس جماعت کو مخاطب کرتے ہوئے قرآن نے کہا تھا۔

وَکَذٰلِکَ جعلنٰکم امۃ وسطا لتکونو شھدا علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا

اس طرح ہم نے تمہیں "امتِ وسطیٰ" بنایا ہے تاکہ تم تمام نوعِ انسانی کے اعمال و کردار کے نگران رہو اور تمہارے اعمال و کردار کا نگران تمہارا امرِ کزِ نظامِ خداوندی ہو۔

ظاہر ہے کہ اس فریضہ کو سرانجام دینے والی جماعت کے پاس اتنی قوت ہونی چاہیئے کہ وہ نہ صرف اپنے آپ کو ہی محفوظ و مصئون رکھ سکے بلکہ دیگر اقوام سے اپنے فیصلوں کو منوا بھی سکے جس عدالت کی پشت پر قوتِ نافذہ نہ ہو اس کے فیصلے قانون کی حیثیت اختیار نہیں کر سکتے محض وعظ بن کر رہ جاتے ہیں۔ دین اور مذہب میں یہی فرق ہوتا ہے۔ مسلمان صدیوں سے دین سے محروم ہو چکا ہے اور مذہب کے فریب میں مبتلا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ، نہ صرف یہ خود ہی نکبت و زبوں حالی کی زندگی بسر کر رہا ہے اور دنیا کی ہر متغلب قوت کے سامنے سپر انداز ہے بلکہ اس کی وجہ سے دنیا "امتِ وسطیٰ" سے بھی محروم ہو چکی ہے جس کا فریضہ "شھداء علی الناس" تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ساری دنیا فتنہ و فساد کا جہنم بن چکی ہے۔ سرکش اور بے باک قوتیں جو چاہتی ہیں وہی ہوتا ہے اور کمزور کے لئے رونے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ چونکہ دنیا میں "امتِ وسطیٰ" کا وجود نہیں رہا۔ اس لئے "شھداء علی الناس" کا فریضہ "کفن چوروں" کے سپرد ہو چکا ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا۔ جہاں خدا کا قانون عمل پیرا نہیں ہوتا وہاں ابلیسی نظام کی بساط بچھ جاتی ہے۔ کیونکہ، خلا محال ہے فطرت کے کارخانے میں۔ یہ وجہ ہے کہ وہ امت جسے امتِ وسطیٰ بننا تھا اپنے فریضے کو فراموش کر کے نہ صرف اپنے جرائم ہی کی سزا بھگت رہی ہے بلکہ دنیا بھر کے جرائم کی پاداش میں بھی بالواسطہ شریک ہے سو جانیوالے چوکیدار کے نہ صرف اپنے کپڑے ہی چوری ہو جاتے ہیں بلکہ وہ صبح اٹھ کر محلہ والوں سے پٹتا بھی ہے۔ لیکن اگر وہ صرف سویا ہوا ہی ہے مر نہیں چکا، تو اس کی بھی امید کی جا سکتی ہے کہ وہ چوروں کی آہٹ پا کر اٹھ بیٹھے اور اس طرح اپنی متاع محفوظ کر لے اور جن کی حفاظت اس کے سپرد تھی ان کی متاعِ حیات بھی محفوظ رہے۔ خدا کرے کہ زمانے کے تھپیڑوں سے جاگ اٹھیں اور ہمارے جاگنے سے چور بھاگ جائیں اور شریف انسان اطمینان کی نیند سوئیں

ملک حنیف وجدانی

شریعت بل ایک نظر میں

۱۳۔ جولائی ۱۹۸۵ء کو سینٹ میں پیش کیا جانے والا پرائیویٹ شریعت بل ۵ سال سے دو ماہ پہلے یعنی ۱۴۔ مئی ۱۹۹۰ء کو وزیر مذہبی امور کے اختلافی ریمارکس کو نظر انداز کرتے ہوئے یک طرفہ طور پر منظور کر لیا گیا۔ یہ بل کس نوعیت کا ہے، اس پر سیر حاصل تبصرہ تو اس کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد ہی ممکن ہوگا البتہ چیدہ چیدہ باتیں جو نمایاں نظر آتی ہیں، ان کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔

۱۔ کاش شریعت بل پیش کرنے والوں کو کوئی ایسا دیدہ ور مل جاتا۔ جو چند قرآنی آیات سے اس کو مزین و منور کر کے وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ (۲/۱۶۵) کا سوز و سرور پیدا کر دیتا۔ جبکہ اس میں ایک بھی قرآنی آیت درج نہیں

۲۔ قرآنی آیت تو کجا! اس میں تو بطور حوالہ ترجمہ و مفہوم بھی کسی مکمل آیت کا تصور نہیں ملتا۔

۳۔ مسلمان کی تعریف تک اس میں شامل نہیں کی گئی۔

۴۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کی حکومت کا کوئی تجزیہ یا موازنہ آیات قرآنی سے درج کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی گئی۔

۵۔ قومی اسمبلی، سینٹ، وفاقی شرعی عدالت، سپریم کورٹ آف پاکستان اور اسلامی نظریاتی کونسل کے وجود کو تسلیم کیا گیا ہے۔

۶۔ اگر ان اداروں کو تسلیم کیا گیا ہے، تو پھر شریعت بل کی ضرورت کیا تھی؟ جو کچھ اس ضمن میں کہا گیا ہے وہ یہ ہے کہ

"ضروری ہے کہ شریعت کے فی الفور نفاذ کو یقینی بنایا جائے۔"

۷۔ اگر اس یقینی نفاذ کی صورت حال کا جائزہ لیں تو ہمیں صرف دو کمیشن قائم کرنے تک لے جایا جاتا ہے اور بس!

(۱) "تعلیم اور ذرائع ابلاغ' کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لئے ایک کمیشن"

"معیشت کو اسلامی بنانا ــــــ یہ کمیشن بھی سال کے اندر اپنی رپورٹ پیش کرے گا۔"

ملاحظہ فرمائیے! اسلامی نظریاتی کونسل موجود ہے۔ ہر سال اپنی رپورٹ پیش کرتی ہے۔ موجودہ شریعت بل کے نفاذ کے بعد محترم صدرِ مملکت دو کمیشن قائم کرنے کے پابند ہونگے، جو تعلیم، ذرائع ابلاغ اور معیشت کو اسلامی بنانے کے لئے سفارشات پیش کریں گے۔ یہ کرے گا شریعت بل اور بس!

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

۸۔ ایک اور تلخ حقیقت ملاحظہ ہو!

(۲۔ تعریفات (ب) کے تحت لکھا ہے:-

"شریعت سے مراد وہ احکام اسلام ہیں جو قرآن و سنّت سے ثابت ہیں"

آگے اس کی تشریح کے تحت لکھا ہے

"شریعت کے چار مآخذ ہیں۔ قرآن، سنّت، اجماع اور قیاس"

ہم تو یہی سنتے آئے ہیں کہ اسلامی قانون کے یہ چار مآخذ قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس ہیں۔ شریعت بل میں نہ صرف یہ کہ حدیث کو سنّت سے بدل دیا گیا ہے بلکہ حدیث کا لفظ تو پورے شریعت بل میں کہیں نظر نہیں آتا ؎

عجائبات ہیں یہ بھی زمانے کے

۱۴ کے تحت لکھا ہے:

"قانونِ موضوعہ کی تشریح و تعبیر کرتے وقت اگر ایک سے زیادہ تشریحات و تعبیرات ممکن ہوں تو عدالت کی طرف سے اس تشریح و تعبیر کو اختیار کیا جائے گا، جو اسلامی اصولوں اور فقہی قواعد و ضوابط اور اصول ترجیح کے مطابق ہو۔ (دوم) جبکہ دو یا دو سے زیادہ تشریحات و تعبیرات مساوی طور پر ممکن ہوں تو عدالت کی طرف سے اس تشریح و تعبیر کو اختیار کیا جائے گا جو اسلامی احکام اور دستور میں بیان کردہ حکمتِ عملی کے اصولوں کو فروغ دے"

یعنی ایک مسئلہ پر متضاد تشریحات و تعبیرات ہوں تو وہاں ترجیح اور حکمتِ عملی کا فروغ اصل مقصد رہ جائے گا۔

جیسے مرحوم جنرل ضیاء الحق کے دور میں مسئلہ رجم پر ایک عدالت نے فیصلہ دیا تو اصول میں تبدیلی تو ایک طرف وہاں اس عدالت کو ہی برخاست کر دیا گیا اور دوسری عدالت نے ضیاء الحق کی

حکمتِ عملی (نظریۂ ضرورت) کو فروغ دینے کے لئے سزائے رجم پر سابقہ طریقِ کار بحال کر دیا۔

چنیں دور آسماں کم دیدہ باشد

غالباً شریعت بل میں قرآن و سنّت کے بعد حکمتِ عملی کی ضرورت ایسے ہی حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے رکھی گئی ہے۔ کیوں نہ ہو ہر ایک کو اپنے تحفظ کا حق تو ملنا ہی چاہیئے۔

اب اسی حکمت کو ایک اور پہلو سے دیکھئے!

۱۷۔ (۵)۔۳ کے تحت لکھا ہے:

"مملکتِ پاکستان کے لاء کالجوں میں فقہ اور اصول فقہ کے جامع اسباق کو نصاب میں شامل کرنے کے لئے موثر اقدامات کرے گی۔"

یہاں قرآن و سنّت کو مخفف کر کے فقہ تک مختصر کر دیا گیا ہے۔ آپ اندازہ فرمائیے کہ قرآن کو کتنے کامیاب حربے سے نظروں سے اوجھل کر دیا گیا۔ اسی کو کہتے ہیں۔ سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

اقوامِ عالم اکیسویں صدی کی دہلیز پر قدم رکھنے کے لئے بڑی مستعدی سے تقاضائے حالات کا جائزہ لے رہی ہیں۔ سوشلسٹ کیمپ ٹوٹ چکا ہے۔ سرمایہ داری، جاگیرداری اور ملوکیت سے ستائی ہوئی جس آبادی نے سوشلسٹ جنّت کا خواب دیکھا تھا، وہ ادھورا رہ گیا۔

علامہ اقبالؒ نے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ:-

مزدکیّت، فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے!

اے کاش شریعت بل قرآن کے عطا فرمودہ بنیادی حقوق کا ترجمان ہوتا اور ہم دنیا کو ایک نقشِ دگر دکھا سکتے۔ بقول اقبالؒ

وقت است کہ در عالم نقشِ دگر انگیزی

افسوس کہ یہ نقشِ دگر شریعت بل میں کہیں موجود نہیں اور ہم ان لوگوں میں شامل ہیں

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ (۲/۱۷۴)

جو قرآنی حقائق کو چھپاتے ہیں اور شریعت کا نام الاپتے ہیں۔

طلوعِ اسلام خود پڑھیئے اور دوسروں کو پیش کیجئے!

حقائق وعبر

علماء پھر تفرقہ باز ہو گئے

جماعت اسلامی نے جب اسلامی نظام کی تحریک شروع کی تو اس وقت علماء حضرات کی خوب خبر لی تھی۔ ان کے بارے میں خود مودودی صاحب نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ:

"یہ لوگ تفرقہ باز اور بد اخلاق ہیں۔ یہ علماء نہیں بلکہ جبّوں اور عماموں میں سیاہ دل اور گندے اخلاق لپٹے ہوئے ہیں۔" (تحریک آزادئ ہند اور مسلمان ص۱۰۳)

پھر فرمایا کہ:-

"اللہ نے اس کی زبان میں ایک ڈنک رکھ دیا ہے جس سے دلوں کو زخمی کئے بغیر وہ کوئی بات نہیں کر سکتا۔" (تنقیحات از مودودی صاحب ص۲۸)

لیکن جب بعد میں جماعت اسلامی نے عملی سیاست میں حصہ لیا تو انہی علماء کو ورثۃ الانبیاء کہنے لگی۔ جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے زمانے میں ان علماء حضرات نے سود کے جواز، اور گھوڑ دوڑ پر جوئے کے فتوے دیئے تو جماعت اسلامی نے ان فتووں پر خاموشی اختیار کر کے ان کے ناجائز فتاویٰ کی عملاً تائید کی۔ لیکن اب مارشل لاء کے خاتمے کے بعد جماعت اسلامی نے ایک دفعہ پھر ان علماء کے خلاف تحریک شروع کر دی ہے اور انہیں کوتاہ نظر، دین سے جاہل اور تفرقہ باز قرار دینا شروع کر دیا ہے۔ اس بارے میں جماعت اسلامی کے ایک سرکردہ لیڈر جناب اسد گیلانی فرماتے ہیں:

"ہمارے اکثر علماء کوتاہ نظر اور تفرقہ باز ہیں اور اسی تفرقہ میں انہوں نے اپنی قیادت اور معیشت کا سامان پیدا کر رکھا ہے۔ اس لئے ان کے وجود کا انحصار ہی اب تفرقہ بازی پر ہے۔ ہمارے امراء عیش پرست، ہوس کار، اور بے فیض ہیں۔ وہ معاشرے کے کمزوروں اور ضعیفوں کی طرف سے آنکھیں بند کئے ہوئے ہیں۔ ان کے ہاتھ سے کسی مسلمان معاشرے میں رفاہِ عامہ کا کوئی ایک کام بھی سرانجام نہیں پاتا ہے۔ اور ہمارے حکام، ظالم، رشوت خور اور غیروں کے ذہنی غلام ہیں۔ انہوں نے ہر جگہ مسلمانوں کو اپنا

غلام بنا رکھا ہے۔ ان کے ذریعے کسی معروف کو سربلند اور کسی منکر کو مٹایا نہیں جا سکتا۔ وہ مجسم شر و فساد ہیں اور ان سے زیادہ ظالم روئے زمین پر دوسرا کوئی گروہ نہیں ہے۔ ان تین طبقات کا ذکر کرتے ہوئے ہم اس حقیقت کو فراموش نہیں کر سکتے کہ امراء اور علماء کے طبقات کو بھی حکام کا طبقہ اپنے پیچھے لگا لیتا ہے اور اپنے اقتدار سے مرعوب اور مفادات سے فیض یاب کر کے اپنا تابع عمل بنا لیتا ہے۔ چنانچہ علماء کی کثیر تعداد اور امراء تمام کے تمام حکام کے رنگ میں ہی رنگ جاتے ہیں۔"

(ماہنامہ محنت کار، بابت مئی ۱۹۹۰ء صفحہ ۱۲)

جہادِ کشمیر کے خلاف مودودی صاحب کا فتویٰ

ان دنوں جماعتِ اسلامی کی جانب سے "جہادِ کشمیر" کے بارے میں تحریک چلائی جا رہی ہے۔ اس سلسلے میں جماعتِ اسلامی کے ترجمان ہفت روزہ ایشیا کی ۲۷ مئی ۱۹۹۰ء کی اشاعت میں مودودی صاحب کا مضمون شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے یہ اعلان کیا ہے:-

جہاد کے سوا کشمیر کے مسئلے کا کوئی اور حل نہیں ہے اور اب ہمارے پاس اتنی مہلت بھی نہیں ہے کہ ہم زیادہ دیر تک انتظار کریں۔ بھارت اب اس بات پر تُل گیا ہے کہ کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت باقی ہی نہ چھوڑے۔ تاکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے استصواب کا مطالبہ ختم ہو جائے۔ (ہفت روزہ ایشیاء، لاہور بابت ۲۷ مئی ۱۹۹۰ء صفحہ ۱۰)

اس مضمون کے بارے میں یہ نہیں بتایا گیا کہ مودودی صاحب نے کب لکھا تھا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ انہوں نے قبر سے یہ مضمون لکھ کر بھیجا ہو، اس لئے یہ جعلی معلوم ہوتا ہے اور اس کا مقصد ان کے اس فتویٰ پر پردہ ڈالنا ہے جس میں انہوں نے جہادِ کشمیر کو حرام قرار دیا تھا۔ اس وقت خود جماعت اسلامی نے اپنے امیر کے فتوے سے ان الفاظ میں لاتعلقی ظاہر کر دی تھی:-

"یہ کوئی فتویٰ نہیں بلکہ امیر جماعت اسلامی کی فقہی رائے تھی۔"

(ماہنامہ ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۴۸ء صفحہ ۳۳۸)

فتویٰ کو ہی تو فقہی رائے کہتے ہیں لیکن عوام کو بے وقوف بنانے کے لئے جماعتِ اسلامی نے خلطِ مبحث کرنے کی کوشش کی۔ ان کے اس فتوے کے کئی سال بعد تک اہل پاکستان مودودی صاحب کی مذمت کرتے رہے۔ جماعت اسلامی کے کراچی سے شائع ہونے والے ایک ہفت روزہ پیمان

نے ۱۹ مارچ ۱۹۷۳ء کو مودودی صاحب کا ایک انٹرویو شائع کیا تھا۔ اس میں بھی انہوں نے جہادِ کشمیر کو حرام قرار دینے والے فتویٰ پر اصرار کرتے ہوئے فرمایا :-

"جہادِ کشمیر کے سلسلے میں میرے نزدیک یہ کوئی معقول بات نہیں ہے کہ وہاں لڑائی بھی ہو اور نہ بھی ہو۔ یعنی ایک طرف ہماری حکومت تمام دنیا کے سامنے اعلان کرے کہ ہم لڑ نہیں رہے بلکہ لڑنے والوں کو روک رہے ہیں اور دوسری طرف وہ لڑے بھی، تو اس سے نہ صرف ہماری اخلاقی پوزیشن خراب ہوگی بلکہ ہم لڑ بھی نہیں سکیں گے۔"
(ہفت روزہ پیمان۔ کراچی۔ بابت ۱۹ مارچ ۱۹۷۳ء صـ)

ہمارے علمائے کرام مسلمانوں پر رحم فرمائیں

ہمارے علمائے کرام نے مساجد میں جس طرح لاؤڈ سپیکر کا غلط استعمال شروع کر رکھا ہے، عوام تو اس سے پہلے ہی بے حد تنگ تھے۔ اب خود علماء حضرات کے بعض طبقات کے لئے یہ مسئلہ قابلِ برداشت نہیں رہا۔ اس سلسلے میں دینی رسالوں میں جماعت اسلامی کے ایک لیڈر محمد صلاح الدین سابق ایڈیٹر روزنامہ جسارت کا مضمون شائع ہوا ہے، جس میں انہوں نے علماء حضرات سے اپیل کی ہے کہ وہ قوم کو لاؤڈ سپیکر کی اذیت رسانی سے نجات دلائیں۔ مضمون کے آخر میں فرماتے ہیں:

"آلۂ مکبّر الصّوت۔ علمائے کرام کا ایسا پسندیدہ کھلونا ہے کہ ہاتھ میں آجائے تو وہ اسے چھوڑنے پر مشکل ہی سے آمادہ ہوتے ہیں۔ پھر شیعوں کی مجلسوں اور سنیوں کی نعتوں کے ٹیپ ہیں جو رات کو چڑھتے ہیں اور صبح اترتے ہیں۔ رمضان المبارک میں سحری کا آخری وقت ۵ بجے ہوگا تو لاؤڈ سپیکر کی چیخ و پکار دو اڑھائی بجے شروع ہو جائے گی اور تراویح کی تھکان سے چور روزہ داروں کو چند گھڑی کے آرام سے بھی محروم کر دیا جائے گا۔ صلوٰۃ وسلام اندرونِ مسجد یا محفل کی جگہ تک محدود رہ جائے تو حقِ عبادت ادا نہیں ہوتا۔ اس کو گلے اور لاؤڈ سپیکر کی پوری قوت کے ساتھ میلوں تک پھیلانا اور لوگوں کے کانوں سے ٹکرا کر ان کی نیندیں اڑانا ضروری سمجھ لیا گیا ہے۔ جو لوگ مساجد یا امام باڑوں کے قریب آباد ہیں، وہ تو ایک کربِ مسلسل کی کیفیت سے دوچار ہیں۔ عبادت گاہوں کے اس شور کی وجہ سے لوگ ان کے قریب رہائش اختیار کرنے سے کترانے لگے ہیں اور ان سے متصل مکانوں کی قیمت اور کرایہ میں بھی خاصی کمی آگئی ہے۔

کیا علمائے کرام اس مصیبت سے نجات دلانے میں بندگانِ خدا اور بالخصوص مریضوں ضعیفوں، طالب علموں اور تہجد گذار لوگوں کی کوئی مدد فرمائیں گے اور آئندہ ماہِ رمضان میں رات کا سکون برباد کرنے اور انفرادی عبادت کے انہماک و استغراق کو غارت کرنے والی سرگرمیوں کی روک تھام پر کوئی توجہ دے سکیں گے؟"

(ہفت روزہ الاعتصام لاہور بابت ۲۵ مئی ۱۹۹۰ء صـ۲۱)

لڑکی کی رضامندی کے بغیر اس کی شادی جائز نہیں

شریعتِ اسلامی میں لڑکی کی رضامندی کے بغیر اس کی شادی جائز نہیں۔ لیکن ہمارے علماء دنیاوی فائدے کے لئے ایسی شادیوں کو جائز قرار دیتے رہے اور نکاح پڑھواتے رہے۔ علمائے اہل حدیث سے اس بارے میں ایک مسئلہ پوچھا گیا کہ ایک نابالغ لڑکی کی شادی کر دی گئی تھی (خیال رہے کہ اب ایسی شادی قانوناً جرم ہے) لیکن بالغ ہونے کے بعد اس نے خاوند کے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا۔ خاوند سے طلاق حاصل کرنے کے لئے اسے روپے پیسے کا لالچ دیا گیا لیکن اس کے باوجود اس نے طلاق دینے سے انکار کر دیا۔ علمائے اہل حدیث نے اس بارے میں فتویٰ دیا ہے کہ طلاق کے بغیر وہ لڑکی دوسری جگہ شادی کر سکتی ہے۔ ان کا فتویٰ انہی کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

"ایک کنواری لڑکی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اس نے بیان کیا کہ میرا نکاح میرے باپ نے جبراً پڑھ دیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اختیار دیدیا کہ اپنے نکاح کو فسخ کرے یا قائم دائم رکھے۔

اسی طرح صحیح مسلم میں ایک روائت کے الفاظ یوں ہیں: وَالبکر تستأذنها ابوها فی نفسها و اذنها صماتها۔ یعنی کنواری سے اس کا باپ اس کے نکاح میں اذن مانگے اور اذن اس کا خاموشی ہے۔ (کیونکہ نطق سے حیاء مانع ہے)

پس مذکورہ دلائل کی روشنی میں لڑکی علیحدگی کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ پنچائت یا بذریعہ عدالت لڑکی کا بیان دلوا کر دوسری جگہ نکاح کر دیا جائے۔ اس حالت میں طلاق کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

واللہ اعلم بالصواب وعلمہ اتم

الراقم:۔ حافظ عبدالقادر روپڑی لاہور ۱۲ رمضان المبارک ۱۴۱۰ھ

(ہفت روزہ تنظیم اہلحدیث بابت ۲۵ مئی ۱۹۹۰ء صـ)

قارئینِ طلوعِ اسلام

ایک دوسرے سے واقف نہیں۔ حالانکہ ان کی حیثیت صرف ایک رسالہ کے خریدار کی نہیں بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ فکر و نظر کی ہم آہنگی کی وجہ سے ایک تحریک کے اجزاء ہیں۔ چنانچہ ہمیں کئی حضرات نے لکھا ہے کہ انہیں ان کے شہر کے قارئین سے متعارف کرادیا جائے تاکہ وہ ایک دوسرے سے قریب ہو جائیں اور مل بیٹھ کر مختلف مسائل پر سوچ بچار کر سکیں۔ یہ تجویز اچھی ہے۔ ہم فکر لوگوں کا ایک دوسرے سے متعارف ہونا ضروری ہے اس کی عملی شکل یہ ہو سکتی ہے کہ جو صاحب سمجھتے ہوں کہ وہ اپنے ہاں کے دیگر احباب کے ایک جگہ بلانے کا انتظام کر لیں گے، ہمیں اطلاع دیں، ہم انہیں اُن کے ہاں کے بزم نشینانِ طلوعِ اسلام کے پتوں سے اطلاع دے دیں گے۔ اس کے بعد وہ انہیں یک جا بلانے کا انتظام کر لیں۔ لیکن آپ اس خیال میں نہ رہیئے کہ آپ کے شہر سے کوئی دوسرا شخص آپ کو لکھ دے گا، آپ ہی پہل کیجئے! اگر ہمارے پاس کسی ایک مقام سے ایک سے زیادہ احباب کی طرف سے خطوط آجائیں تو اس میں بھی کچھ مضائقہ نہیں۔ لیکن اگر ہر شخص اسی خیال میں رہا کہ اس کے لئے کسی دوسرے شخص نے لکھ دیا ہوگا تو ہمارے پاس کسی ایک کی طرف سے بھی اطلاع نہیں پہنچے گی۔ اس میں تاخیر نہ کیجئے۔ بڑے بڑے شہروں میں یہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ مختلف علاقوں کے احباب کو ان کے علاقوں میں کسی ایک جگہ جمع کر لیا۔ اس لئے آپ خط لکھتے وقت اپنے علاقے یا محلے کا پتہ ضرور لکھیں۔ آپ کو تھوڑی سی تکلیف تو ضرور ہوگی۔ لیکن اس کا نتیجہ بہت مفید برآمد ہوگا۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام
۲۵۔ بی گلبرگ ۲۔ لاہور ۱۱

قرآنی تعلیم۔ بچوں کے لیئے

حج

قاسم نوری

السّلام علیکم بچّو! بھئی اب تک تو آپ دینِ اسلام، قرآنِ کریم، فرشتے، رسول اور اللہ تبارک وتعالےٰ کے بارے میں بہت کچھ جان چکے ہوں گے اور یہ بات بھی سمجھ چکے ہوں گے کہ اللہ نے جو بھی قانون بنایا، جو بھی ہدائت بھیجی اور جو بھی حکم دیا وہ اپنے کسی فائدے یا بھلے کے لئے نہیں دیا بلکہ ہماری ہی بھلائی کے لئے دیا۔ بھئی اللہ تو کسی بات کا محتاج ہی نہیں ہوتا اور نہ اسے ہماری کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہ اگر کوئی حکم دیتا ہے تو ہمارے ہی بھلے کے لئے ہوتا ہے۔

تو آج ہم آپ کو 'حج' کے بارے میں آپ کو بتائیں گے کہ یہ کیا ہوتا ہے؟ اور ہمیں اس سے کیا فائدہ ہوتا ہے؟ اور اسی سے آپ کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ عیدالاضحیٰ یا عیدِ قربان کیا ہوتی ہے؟ اچھا یہ تو آپ جانتے ہیں نا کہ ہر آدمی کی پہچان اس کے گھر سے ہوتی ہے۔ جس طرح ہر قوم کی پہچان اس کے ملک سے ہوتی ہے۔ اسی طرح کاروبار کے لئے "جگہ" یا دفتر ضروری ہوتا ہے اور عبادت کرنے کے لئے گرجا (چرچ) مندر اور مسجد وغیرہ بنائے جاتے ہیں گویا ہر کام اور پہچان کے لئے کسی نہ کسی "مرکز" کا ہونا ضروری ہوتا ہے اور یہ کسی نہ کسی مقصد کو پانے یا پورا کرنے کے لیئے بھی ہوتا ہے۔ اب جس طرح کوئی کاروبار، دفتر، مرکز وغیرہ کے بغیر

نہیں کیا جا سکتا۔ لوگ ٹھکانوں، مکانوں اور گھروں کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اگر رہیں تو جانوروں کی طرح رہنا پڑے گا۔ عبادتیں عبادت گاہوں کے بغیر مقصد پورا نہیں کر سکتیں۔ اسی طرح کوئی جماعت یا پارٹی بھی کسی مرکز کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی۔

تو بچو! جب اللہ تعالےٰ نے تمام دنیا کے انسانوں کی بھلائی کے لیئے اپنا دین اور نظام بھیجا تو اس کے لیئے کسی نہ کسی مرکز کی تو ضرورت تھی نا — جہاں دنیا بھر کے انسانوں کے نمائندے اکھٹے ہو سکیں اور جہاں سے ان کو اللہ کی طرف سے یہ ہدائت مل سکے کہ وہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ تو بھئی! اللہ تعالےٰ نے ملک عرب کے ایک شہر "مکّہ" میں ایک جگہ کا انتخاب کیا اور اپنے محبوب اور پیارے پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السّلام سے کہا کہ وہ اس مرکز کی نشانی کے طور پر اس جگہ ایک عمارت تعمیر کریں چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے وہاں ایک چھوٹا سا گھر (خانہ کعبہ) بنا دیا۔ چونکہ وہ ساری دنیا کے انسانوں کی ہدایت کا مرکز تھا اور یہیں سے اللہ کا پیغام اور اللہ کی ہدایت ساری دنیا کو پہنچنی تھی۔ اس لیئے اللہ نے اسے اپنا گھر کہہ کر پکارا۔ ویسے تو آپ سب بچے جانتے ہیں نا کہ اللہ کا تو گھر ہوتا ہی نہیں وہ تو ان چیزوں سے بہت بلند، بہت ہی بلند ہے لیکن چونکہ یہ مرکز تھا لہٰذا اللہ نے کہا کہ جو بھی اس مرکز کی طرف آیا وہ امن اور حفاظت میں آگیا۔ (۳/۹۵)

تو بچو! ایک بات تو یہ سمجھ میں آئی کہ "حج" صرف مسلمانوں ہی کے لئے خاص نہیں ہے۔ بھئی یہ تو اسلام سے بھی بہت پہلے سے ہوتا آرہا ہے اور سا

دنیا کے انسانوں کے لئے کہا گیا ہے۔

دیکھو بھئی! قرآنِ مکرّم میں خود بھی اس کا ذکر موجود ہے۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا:

"بلاشبہ پہلا گھر جو تمام انسانوں کے لیئے (بطور مرکز) بنایا گیا" (3/95)

بچّو! حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے زمانے میں ایک رسم یا رواج یوں تھا کہ جب لوگ آپس میں کسی وعدہ یا عہد کو پکّا اور مضبوط بناتے یا ظاہر کرنا چاہتے تھے تو ایک پتھّر پر ہاتھ مارتے تھے بالکل اسی طرح جیسے آج بھی کچھ لوگ ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہیں یا ہاتھ ملاتے ہیں۔ اچھّا اس رسم کو اللہ تعالےٰ نے بُرا نہیں سمجھا اور رہنے دیا۔ چنانچہ جب لوگ یہاں اکٹھے ہوتے ہیں تو اللہ تعالےٰ سے ایک عہد کرتے ہیں اور ایک کالے پتھّر (حجرِ اسود) کو چھُوتے اور چومتے ہیں۔ بھئی وہ عہد بھی سن لو جو وہاں لوگ اللہ سے کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے۔

"میری صلوٰۃ۔ میرا حج۔ میرا مرنا جینا سب اللہ کے (قانون کی اطاعت اور پروگرام کی تکمیل) کے لئے ہے۔" (6/162)

گویا جو لوگ اللہ کے رسولوں اور کتابوں (وحی) پر ایمان لے آتے تھے تو وہ بے چین ہوتے تھے کہ ایمان لانے کے بعد ہم کیا کریں اور اللہ کے پروگرام کی تکمیل کیسے کریں، اسے دوسروں تک کس طرح پہنچائیں۔ تو اس کیلئے پروگرام یوں بنایا گیا کہ سال میں ایک مرتبہ تین دن کے لئے دنیا بھر سے انسانوں کے نمائندے اور جو بھی ایمان لانا چاہے یا دین کے نظام کو سمجھنا اور دیکھنا چاہے ایک میدان میں جس کا نام "عرفات" ہے آجائے اور کسی پر پابندی نہ ہو، نہ نسل کی، نہ رنگ کی نہ کسی امیر غریب کی اور نہ قوم اور مُلک کی۔

بھئی جب حج پوری دنیا کے انسانوں کے لئے ہُوا تو پھر تو کسی بھی چیز کی پابندی نہیں ہوسکتی حتیٰ کہ زبان کی پابندی بھی نہیں ہوسکتی ۔۔۔ اب شرط یہ لگائی گئی کہ چونکہ اللہ تعالےٰ سارے انسانوں میں برابری چاہتا ہے لہٰذا حج کی صورت میں ایک جیسا لباس سب پہنیں۔ آپ اسے یونیفارم سمجھ سکتے ہیں۔ اسی کو "احرام" یعنی بن سلی چادر کہہ لیں ۔۔۔ اس موقع پر ساری دنیا کے انسانوں کا منتخب نمائندہ (امیر) منبر پر کھڑا ہوتا اور اسلام کا مقصد واضح کرتا ۔۔۔ گزشتہ سال کی کاروائی، نقصانات اور فوائد سے آگاہ کرتا اور آئندہ سال کے لئے بتاتا کہ سب کو واپس جاکر ایک سال تک کیا کیا کرنا ہے ۔۔۔ پھر سب اچھی طرح اس پروگرام کو سمجھ لیتے اور ایک دوسرے کو سمجھا دیتے تو اجتماعی طور پر شکرانے کے لئے اللہ کے حضور جھک جاتے اور دعا کرتے کہ اللہ اس پروگرام کی تشکیل اور تکمیل میں ان کی مدد کرے۔ اسی طرح ہر ملک اور بستی کے لوگ بھی ایک جگہ اکٹھے ہو جاتے کہ ایک ساتھ ہم سب بھی آئندہ سال کا پروگرام سنیں پھر وہ بھی اپنے اپنے طور پر ایک دوسرے سے ہاتھ ملاتے، گلے ملتے اور عہد باندھ کر سجدۂ شکر ادا کرتے ۔ انہیں بھی ہر بستی اور ہر شہر کا امیر (خطیب) میدانِ عرفات میں دیئے گئے اور بتائے گئے پروگرام سے آگاہ کرتا اور اسے یہ لوگ "عید الاضحیٰ" کہہ کر پکارتے۔

اچھا، بچو! "مکہ" میں حج کے موقع پر جو اجتماع ہوتا تھا نا تو وہاں کوئی کسی کا میزبان یا مہمان نہیں ہوتا تھا۔ سب ہی ایک دوسرے کے میزبان بھی ہوتے تھے۔ اور مہمان بھی۔ پکنک کا سا مزہ آتا تھا۔

تم نے "وَن ڈِش" پارٹی کا نام تو سنا ہی ہوگا نا۔ بس اسی طرح جو بھی وہاں جاتا تھا اپنے اپنے ساتھ کوئی جانور لے جاتا تھا۔ کسی کے پاس اونٹ ہے، کسی کے پاس بھیڑ ہے، کسی کے پاس گائے یا بکری یا ایسے ہی جانور جو راستے میں سامان اٹھانے کے کام بھی آتے تھے اور بعد میں ان کو ذبح کر کے سب کے ساتھ بطور "وَن ڈش" استعمال کرتے تھے۔ تو یہ ہے 'حج' اور اس کا مقصد۔ اب دیکھو کہ قرآنِ کریم میں اللہ نے فرمایا ہے کہ :۔

"لوگوں کو دعوت دو کہ وہ حج کے اجتماع میں آکر دیکھیں کہ ان کے فائدے کے لئے کیا کچھ کیا جا رہا ہے" $(\frac{22}{28})$

بھئی اسی لئے تو مکہ کو "ھدی للعلمین" تمام دنیا کے لئے ہدائت کا سرچشمہ اور کعبہ کو "قیاماً للناس" یعنی تمام نوعِ انسانی کی بقا اور قیام کا ذریعہ کہا گیا ہے اور بھئی یہ تو ایک اٹل حقیقت ہے کہ :۔

"جو شئے، جو نظریہ، جو نظام، جو عمل ساری دنیا اور ساری انسانیت کے لئے نفع بخش ہو وہ ہی باقی رہ سکتا ہے" $(\frac{13}{17})$

تو ہم مسلمانوں کے خیالات کا، سوچ کا مرکز ہے قرآنِ کریم ـــــ اور اطاعت کا مرکز ہوگا اسلامی نظام یا اسلامی حکومت اور اجتماعیت کا مرکز "بیت الحرام" ـــــ اور جب تک ہم اس حقیقت پر ایمان نہیں لائیں گے۔ یعنی اس میں داخل نہیں ہونگے۔ نہ امن نصیب ہوگا اور نہ کسی قسم کی حفاظت میسّر آئے گی!

قاسم نوری

پرچہ اپنے دوستوں کو بھی پیش کیجئے!

سینیٹ کا منظور کردہ شریعت بل

سینٹ کا پاس کردہ "نفاذِ شریعت بل ۱۹۹۰ء" ہدیۂ قارئین ہے۔

ہر گاہ کہ قرار دادِ مقاصد کو جو پاکستان میں شریعت کو بالا دستی عطا کرتی ہے، دستور اسلامی جمہوریہ پاکستان ۱۹۷۳ء کے مستقل حصّے کی حیثیت سے شامل کر لیا گیا ہے۔

اور ہر گاہ کہ مذکورہ قرار دادِ مقاصد کی اغراض کو بروئے کار لانے کے لئے ضروری ہے کہ شریعت کے فی الفور نفاذ کو یقینی بنایا جائے۔ لہٰذا حسب ذیل قانون بنایا جاتا ہے :-

۱۔ مختصر عنوان، وسعت اور آغازِ نفاذ :- یہ ایکٹ نفاذِ شریعت ایکٹ ۱۹۹۰ کے نام سے موسوم ہوگا۔

۲۔ یہ پورے پاکستان پر وسعت پذیر ہوگا۔

۳۔ یہ فی الفور نافذ العمل ہوگا۔

۴۔ اس میں شامل کسی امر کا اطلاق غیر مسلموں کے شخصی قوانین پر نہیں ہوگا۔

تعریفات

اس ایکٹ میں تاوقتیکہ متن سے اس سے مختلف مطلوب ہو مندرجہ ذیل عبارت سے وہ مفہوم مراد ہے جو یہاں ترتیب وار دیا گیا ہے۔

(الف) "حکومت" سے مراد :

اوّل۔ کسی ایسے معاملے سے متعلق جسے دستور میں وفاقی قانون سازی کی فہرست یا مشترکہ قانون سازی کی فہرست میں شمار کیا گیا ہو یا کسی ایسے معاملے کے بارے میں جس کا تعلق "وفاق" سے ہو "وفاقی حکومت" ہے۔

دوم۔ کسی ایسے معاملے سے متعلق جسے مذکورہ فہرستوں میں سے کسی ایک میں شمار نہ کیا

گیا ہو یا کسی ایسے معاملے کے بارے میں جس کا تعلق صوبے سے ہو "صوبائی حکومت" ہے۔

(ب) "شریعت" سے مراد وہ احکام اسلام ہیں جو قرآن و سنت سے ثابت ہیں۔

تشریح

شریعت کی تشریح و تفسیر کرتے وقت قرآن و سنت کی تشریح و تفسیر کے مسلمہ اصول و قواعد کی پابندی کی جائے گی اور راہنمائی کے لئے اسلام کے مسلمہ فقہاء کی تشریحات اور آراء کا لحاظ رکھا جائے گا۔ جیسا کہ دستور کی دفعہ ۲۲۷ شق (۱) کی تشریح میں ذکر کیا گیا ہے۔

(ج) "**عدالت**" سے کسی عدالتِ عالیہ کے ماتحت کوئی عدالت مراد ہے۔ اس میں وہ ٹریبونل یا مقتدرہ شامل ہے جسے فی الوقت نافذ العمل کسی قانون کی رُو سے یا اس کے تحت قائم کیا گیا ہو۔

(د) "قرار دادِ مقاصد" سے مراد وہ قرار دادِ مقاصد ہے جس کا حوالہ دستور کے آرٹیکل ۲ (الف) میں دیا گیا ہے اور جس کو دستور کے ضمیمے میں درج کیا گیا ہے۔

(ھ) "مقررہ" سے مراد اس ایکٹ کے تحت مقررہ قواعد ہیں۔

(و) "مستند دینی مدرسہ" سے مراد پاکستان یا بیرونِ پاکستان کا وہ دینی مدرسہ ہے جسے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن یا حکومت قواعد کے مطابق تسلیم کرتی ہے۔

(ز) "مفتی" سے مراد شریعت سے کما حقہ واقف وہ مسلمان عالم ہے جو کسی باقاعدہ مستند دینی مدرسہ کا سند یافتہ اور تخصص فی الفقہ کی سند حاصل کر چکا ہو اور پانچ سال کسی مستند دینی علومِ اسلامی کی تدریس یا افتاء کا تجربہ رکھتا ہو یا جو دس سال تک کسی مستند دینی مدرسے میں علومِ اسلامی کی تدریس یا افتاء کا تجربہ رکھتا ہو اور جسے اس قانون کے تحت شریعت کی تشریح اور تعبیر کرنے کے لئے عدالتِ عظمیٰ، کسی عدالتِ عالیہ یا وفاقی شرعی عدالت کی اعانت کے لئے مقرر کیا گیا ہو۔

۳۰ شریعت کی بالادستی

شریعت پاکستان کا اعلیٰ ترین قانون ہوگی اور اسے مذکورہ ذیل طریقے سے نافذ کیا جائے گا اور کسی دیگر قانون، رواج یا دستور العمل میں شامل کسی امر کے علی الرغم موثر ہوگی۔

۴ عدالتیں شریعت کے مطابق مقدّمات کا فیصلہ کریں گی۔

(۱) اگر کسی عدالت کے سامنے یہ سوال اٹھایا جائے کہ کوئی قانون یا قانون کا کوئی حکم شریعت کے منافی ہے تو عدالت، اگر اسے اطمینان ہو کہ سوال غور طلب ہے، ایسے معاملات کی نسبت جو دستور کے تحت وفاقی شرعی عدالت کے اختیارِ سماعت کے اندر آتے ہوں، وفاقی شرعی عدالت سے استصواب کرے گی اور مذکورہ عدالت مقدّمہ کا ریکارڈ طلب کر سکے گی اور اس کا جائزہ لے سکے گی اور امرِ تنقیح طلب کا ساٹھ دِن کے اندر اندر فیصلہ کرے گی۔

مگر شرط یہ ہے کہ اگر سوال کا تعلق کسی ایسے مسئلے سے ہو جو دستور کے تحت وفاقی شریعت کورٹ کے دائرۂ اختیار سے باہر ہو تو عدالت امرِ تنقیح طلب کو عدالتِ عالیہ کے حوالے کر دے گی جو اس کا ساٹھ دِن کے اندر اندر فیصلہ کرے گی۔

مزید شرط یہ ہے کہ عدالت کسی ایسے قانون یا قانون کے حکم کی نسبت اس کے شریعت کے منافی ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں کسی سوال پر غور نہیں کرے گی جس کا وفاقی شرعی عدالت یا عدالتِ عظمیٰ کی شرعی مراقعہ بنچ پہلے ہی جائزہ لے چکی ہو اور اس کے شریعت کے منافی نہ ہونے کا فیصلہ کر چکی ہو۔

(۲) ذیلی دفعہ (۱) کا دوسرا فقرہ شرطیہ وفاقی شرعی عدالت یا عدالتِ عظمیٰ کی شرعی مراقعہ بنچ کی جانب سے دیئے گئے کسی فیصلے یا صادر حکم پر نظرِ ثانی کرنے کے اختیار پر اثر انداز نہیں ہوگا۔

(۳) عدالتِ عالیہ خود اپنی تحریک پر یا پاکستان کے کسی شہری یا وفاقی حکومت یا کسی صوبائی حکومت کی درخواست پر یا ذیلی دفعہ (۱) کے پہلے فقرہ شرطیہ کے تحت اس سے کئے گئے کسی استصواب پر، اس سوال کا جائزہ لے سکے گی اور فیصلہ کر سکے گی کہ آیا کوئی مسلم شخصی قانون کسی عدالت یا ٹریبونل کے ضابطۂ کار سے متعلق کوئی قانون یا کوئی اور قانون جو وفاقی شرعی عدالت کے دائرۂ اختیار سے باہر ہو یا مذکوہ قانون کا کوئی حکم شریعت کے منافی ہے یا نہیں۔

مگر شرط یہ ہے کہ سوال کا جائزہ لیتے ہوئے عدالتِ عالیہ توضیح طلب سوال سے متعلقہ شعبہ کا تخصیصی ادراک رکھنے والے ماہرین میں سے، جن کو وہ مناسب سمجھے کو طلب کریگی اور ان کے نقطۂ نظر کی سماعت کرے گی۔

(۴) جب کہ عدالتِ عالیہ ذیلی دفعہ (۳) کے تحت کسی قانون یا قانون کے حکم کا جائزہ لینا شروع

کرے اور اسے ایسا قانون یا قانون کا حکم شریعت کے منافی معلوم ہو تو عدالتِ عالیہ ایسے قانون کی صورت میں جو دستور میں وفاقی فہرستِ قانون سازی یا مشترکہ فہرست قانون سازی میں شامل کسی معاملے سے متعلق ہو وفاقی حکومت کو یا کسی ایسے معاملے سے متعلق کسی قانون کی صورت میں جو ان فہرستوں میں سے کسی ایک میں بھی شامل نہ ہو صوبائی حکومت کو ایک نوٹس دے گی جس میں ان خاص احکام کی صراحت ہوگی جو اسے بادی طور پر منافی معلوم ہوں اور مذکورہ حکومت کو اپنا نقطہ نظر عدالتِ عالیہ کے سامنے پیش کرنے کے لئے مناسب موقع دے گی۔

(۵) اگر عدالتِ عالیہ فیصلہ کرے کہ کوئی قانون یا قانون کا کوئی حکم شریعت کے منافی ہے تو وہ اپنے فیصلے میں حسب ذیل بیان کرے گی:-

(الف) اس کی مذکورہ رائے قائم کرنے کی وجوہ۔

(ب) وہ حد جہاں تک ایسا قانون یا حکم بادی طور پر منافی ہے، اور

(ج) اس تاریخ کا تعین جس پر وہ فیصلہ نافذ العمل ہوگا۔

مگر شرط یہ ہے کہ ایسا کوئی فیصلہ اس معیاد کے گزرنے سے پہلے جس کے اندر عدالتِ عظمیٰ میں اس کے خلاف اپیل دائر ہو سکتی ہو یا جب کہ اپیل بادی طور پر داخل کر دی گئی ہو، اس اپیل کے فیصلے سے پہلے نافذ العمل نہیں ہوگا

(۶) عدالت عالیہ کو اس دفعہ کے تحت اپنے دیئے ہوئے کسی فیصلے یا صادر کردہ کسی حکم پر نظرثانی کرنے کا اختیار ہوگا۔

(۷) اس دفعہ کی رُو سے عدالتِ عالیہ کو عطا کردہ اختیارِ سماعت کم از کم تین ججوں کی کوئی بنچ استعمال کرے گی

(۸) اگر ذیلی (۱) یا ذیلی دفعہ (۲) میں محولہ کوئی سوال عدالتِ عالیہ کی یک رکنی بنچ یا دو رکنی بنچ کے سامنے اٹھے تو اسے کم از کم تین ججوں کی بنچ کے حوالے کیا جائے گا۔

(۹) اس دفعہ کے تحت کسی کاروائی میں عدالتِ عالیہ کے قطعی فیصلے سے ناراض کوئی فریق مذکورہ فیصلے سے ساٹھ دن کے اندر عدالتِ عظمیٰ میں اپیل داخل کر سکے گا۔

مگر شرط یہ ہے کہ وفاق یا کسی صوبے کی طرف سے اپیل مذکورہ فیصلے کے چھ ماہ کے اندر داخل کی جا سکے گی۔

(۱۰) اس قانون میں شامل کوئی امر یا اس کے تحت کوئی فیصلہ اس قانون کے آغازِ نفاذ سے قبل کسی

عدالت یا ٹریبونل، یا مقتدرہ کی طرف سے کسی قانون کے تحت دی گئی سزاؤں، دیئے گئے احکام یا سنائے ہوئے فیصلوں، منظور شدہ ڈگریوں، ذمہ کئے گئے واجبات، حاصل شدہ حقوق کی گئی تشخیصات، وصول شدہ رقوم، یا اعلان کردہ قابلِ ادا رقوم پر اثر انداز نہیں ہوگا۔

تشریح

اس ذیلی دفعہ کی غرض کے لئے "عدالت" یا "ٹریبونل" سے مراد اس قانون کے آغازِ نفاذ سے قبل کسی وقت کسی قانون یا دستور کی رُو سے یا اس کے تحت قائم شدہ کوئی عدالت یا ٹریبونل ہوگی اور لفظ "مقتدرہ" سے مراد فی الوقت نافذ العمل کسی قانون کے تحت قائم شدہ کوئی مقتدرہ ہوگی۔

(۱۱) کوئی عدالت یا ٹریبونل بشمول عدالتِ عالیہ کسی زیرِ سماعت یا اس قانون کے آغازِ نفاذ کے بعد شروع کی گئی کسی کاروائی کو محض اس بناء پر موقوف یا ملتوی نہیں کرے گی کہ یہ سوال کہ آیا کوئی قانون یا قانون کا حکم شریعت کے منافی ہے یا نہیں۔ عدالتِ عالیہ یا وفاقی شرعی عدالت کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ یا یہ کہ عدالتِ عالیہ نے اس سوال کا جائزہ لینا شروع کر دیا ہے۔ اور ایسی کاروائی جاری رہے گی اور اس میں امرِ دریافت طلب کا فیصلہ فی الوقت نافذ العمل قانون کے مطابق کیا جائے گا۔

بشرطیکہ عدالتِ عالیہ ابتدائی سماعت کے بعد یہ فیصلہ نہ دے دے کہ زیرِ سماعت مقدمات کو عدالت ..... کے فیصلے تک روک دیا جائے۔

۵۔ شریعت کے خلاف احکامات دینے پر پابندی: انتظامیہ کا کوئی بھی فرد بشمول صدرِ مملکت، وزیرِ اعظم اور وزیرِ اعلیٰ شریعت کے خلاف کوئی حکم نہیں دے سکے گا اور اگر ایسا کوئی حکم دے دیا گیا ہو تو اسے عدالتِ عالیہ میں چیلنج کیا جا سکے گا۔

۶۔ عدالتی عمل اور احتساب: حکومت کے تمام عمال دستور کے تابع رہتے ہوئے اسلامی نظامِ انصاف کے پابند ہوں گے اور شریعت کے مطابق عدالتی احتساب سے بالاتر نہیں ہونگے۔

۷۔ علماء کرام کو جج اور معاونینِ عدالت مقرر کیا جا سکے گا:

(۱) ایسے تجربہ کار اور مستند علماء جو اس قانون کے تحت مفتی مقرر کئے جانے کے اہل ہوں۔ عدالتوں کے ججوں اور معاونینِ عدالت کے طور پر مقرر کئے جانے کے بھی اہل ہونگے۔

(۲) ایسے اشخاص جو پاکستان یا بیرونِ ملک اس مقصد کے لئے متعلقہ حکومت کے تسلیم شدہ اسلامی امور کے معروف اداروں اور مستند دینی مدارس سے شریعت کا راسخ علم رکھتے ہوں، فی الوقت نافذ العمل کسی دیگر قانون میں شامل کسی امر کے باوجود شریعت کی تشریح اور تعبیر کے لئے عدالت کے سامنے اس مقصد کے لئے وضع کئے جانے والے قواعد کے مطابق پیش ہونے کے اہل ہوں گے۔

(۳) صدر، چیف جسٹس عدالتِ عالیہ کے مشورے سے ذیلی دفعہ (۱) کی غرض کے لئے قواعد مرتب کرے گا۔ جن میں ججوں اور عدالتوں میں معاونینِ عدالت کی حیثیت سے تقرر کے لئے مطلوبہ اہلیت اور تجربہ کی وضاحت ہوگی۔

(۴) ایسے اشخاص جو بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد یا کسی دیگر یونیورسٹی سے قانون اور شریعت میں گریجویٹ یا پوسٹ گریجویٹ ڈگریاں رکھتے ہوں، فی الوقت نافذ العمل کسی دیگر قانون میں شامل کسی امر کے باوجود اس غرض کے لئے حکومت کے وضع کردہ قواعد کے مطابق ایڈووکیٹ کی حیثیت سے اندراج کے اہل ہوں گے۔

(۵) اس دفعہ کے احکام کسی طور پر بھی قانون پیشہ اشخاص اور مجالس وکلاء سے متعلق قانون کے تحت اندراج شدہ وکلاء کے مختلف عدالتوں اور ٹریبونلوں اور دیگر مقتدرات بشمول عدالتِ عظمیٰ کسی عدالتِ عالیہ یا وفاقی شرعی عدالت میں پیش ہونے کے حق پر اثرانداز نہیں ہوں گے۔

۸۔ مفتیوں کا تقرر

(۱) صدر چیف جسٹس پاکستان یا چیف جسٹس وفاقی عدالت اور چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل کے مشورہ سے جس طرح وہ مناسب تصور کرے، ایسے اور اتنے مفتیوں کا تقرر کرے گا، جو عدالتِ عظمیٰ، عدالتِ عالیہ اور وفاقی شرعی عدالت کی شریعت کے احکام کی تعبیر و تشریح میں اعانت کے لئے مطلوب ہوں۔

(۲) ذیلی دفعہ (۱) کے تحت مقرر کردہ کوئی مفتی صدر کی رضامندی کے دوران اپنے عہدے پر فائز رہے گا اور اس کا عہدہ فی الوقت کسی نائب اٹانی جنرل برائے پاکستان کے برابر ہوگا۔

(۳) مفتی کا یہ فرض ہوگا کہ وہ حکومت کو ایسے قانونی امور کے بارے میں جن پر شریعت کی تشریح و تعبیر درکار ہو مشورہ دے اور ایسے دیگر فرائض انجام دے جو حکومت کی طرف

سے اس کے سپرد یا اس کو تفویض کئے جائیں اور اسے حق حاصل ہوگا کہ اپنے فرائض کی بجا آوری میں عدالتِ عظمیٰ اور عدالتِ عالیہ میں جب کہ وہ اس قانون کے تحت اختیارِ سماعت استعمال کر رہی ہوں اور وفاقی شرعی عدالت میں سماعت کے لئے پیش ہو۔

(۴) کوئی مفتی کسی فریق کی وکالت نہیں کرے گا بلکہ کاروائی سے متعلق اپنی دانست کے مطابق شریعت کا حکم بیان کرے گا۔ اس کی توضیح، تشریح و تعبیر کرے گا اور شریعت کی تشریح کے بارے میں اپنا تحریری بیان عدالت میں پیش کرے گا۔

(۵) حکومتِ پاکستان کی وزارتِ قانون و الضاف مفتیوں کے بارے میں انتظامی امور کی ذمہ دار ہوگی

۹۔ شریعت کی تدریس و تربیت :۔

(۱) مملکت، اسلامی قانون کے مختلف شعبوں میں تعلیم و تربیت کے لئے موثر انتظامات کرے گی تاکہ شریعت کے مطابق نظامِ عدل کے لئے تربیت یافتہ افراد دستیاب ہوسکیں۔

(۲) مملکت ماتحت عدلیہ کے ارکان کے لئے وفاقی جوڈیشل اکادمی اسلام آباد اور اس طرح کے دیگر اداروں میں مسلّمہ مکاتبِ فکر کے فقہ اور اصولِ فقہ کی تدریس و تربیت نیز باقاعدہ وقفوں سے تجدیدی پروگراموں کے انعقاد کے لئے موثر انتظامات کریگی۔

۱۰۔ معیشت کو اسلامی بنانا :

(۱) مملکت اس امر کو یقینی بنانے کے لئے اقدامات کرے گی کہ پاکستان کے معاشی نظام کی تعمیر اجتماعی عدل کے اسلامی معاشی اصولوں، اقدار اور ترجیحات کی بنیاد پر کی جائے اور دولت کمانے کے ان تمام ذرائع پر پابندی ہو جو خلافِ شریعت ہیں۔

(۲) صدر، اس قانون کے آغازِ نفاذ کے ساٹھ دن کے اندر، ایک مستقل کمیشن مقرر کرے گا جو ماہرین معاشیات، علماء اور منتخب نمائندگانِ پارلیمنٹ پر مشتمل ہوگا۔ جس کو وہ موزوں تصوّر کرے اور ان سے ایک کو اس کا چیئرمین مقرر کرے گا۔

(۳) کمیشن کے چیئرمین کو حسبِ ضرورت مشیر مقرر کرنے کا اختیار ہوگا۔

(۴) کمیشن کے کارہائے منصبی حسب ذیل ہوں گے :

(۱) معیشت کو اسلامی بنانے کے عمل کی نگرانی کرنا اور عدم تعمیل کے معاملات وفاقی حکومت

کے علم میں لانا۔

(ب) کسی مالیاتی قانون یا محصولات اور فیسوں کے عائد کرنے اور وصول کرنے سے متعلق کسی قانون یا بینکاری اور بیمہ کے عمل اور طریقہ کار کو اسلام سے ہم آہنگ کرنے کیلئے سفارش کرنا۔

(ج) دستور کے آرٹیکل ۳۸ کی روشنی میں عوام کی سماجی اور معاشی فلاح و بہبود کے حصول کے لئے پاکستان کے معاشی نظام میں تبدیلیوں کی سفارش کرنا، اور

(د) ایسے طریقے اور اقدامات تجویز کرنا جن میں ایسے موزوں متبادلات شامل ہوں جن کے ذریعے وہ نظامِ معیشت نافذ کیا جا سکے جسے اسلام نے پیش کیا ہے۔

(۵) کمیشن کی سفارش پر مشتمل ایک جامع رپورٹ اس کے تقرر کی تاریخ سے ایک سال کی مدت کے اندر وفاقی حکومت کو پیش کی جائے گی اور اس کے بعد کمیشن حسبِ ضرورت وقتاً فوقتاً اپنی رپورٹیں پیش کرتا رہے گا۔ البتہ سال میں کم ازکم ایک رپورٹ پیش کرنا لازمی ہوگا۔ کمیشن کی رپورٹ حکومت کو موصول ہونے کے ۳ ماہ کے اندر پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں اور تمام صوبائی اسمبلیوں کے سامنے بحث کے لئے پیش کی جائے گی۔

(۶) کمیشن کو ہر لحاظ سے، جس طرح وہ مناسب تصور کرے اپنی کاروائی کے انصرام اور اپنے طریقۂ کار کے انضباط کا اختیار ہوگا

(۷) جملہ انتظامی مقتدرات، ادارے اور مقامی حکام کمیشن کی اعانت کریں گے۔

(۸) وزارت خزانہ حکومت پاکستان اس کمیشن سے متعلق انتظامی امور کی ذمہ دار ہوگی۔

۱۱۔ ذرائع ابلاغِ عامہ اسلامی اقدار کو فروغ دیں گے:

مملکت کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ ایسے مؤثر اقدام کرے جن کے ذریعہ ابلاغِ عامہ سے اسلامی اقدار کو فروغ ملے۔ نیز نشر و ابلاغ کے ہر ذریعے سے خلافِ شریعت پروگرام، فحش اور منکرات کی اشاعت پر پابندی ہوگی۔

۱۲۔ تعلیم کو اسلامی بنانا:

(۱) مملکت اسلامی معاشرہ کی حیثیت سے جامع اور متوازن ترقی کے لئے مؤثر اقدامات کرے گی۔ تاکہ اس امر کو یقینی بنایا جا سکے کہ پاکستان کے نظامِ تعلیم و تدریس کی اساس اسلامی اقدار پر ہو۔

(۲) صدرِ مملکت اس قانون کے آغازِ نفاذ کے ساٹھ دن کے اندر تعلیم اور ذرائع ابلاغ کو

کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لئے ایک کمیشن مقرر کرے گا جو ماہرینِ تعلیم، ماہرینِ ابلاغِ عامہ، علماء اور منتخب نمائندگانِ پارلیمنٹ پر مشتمل ہوگا۔ جن کو وہ موزوں تصور کرے اور ان میں سے ایک کو اس کا چیئرمین مقرر کرے گا۔

(۳) کمیشن کے چیئرمین کو حسبِ ضرورت مشیر مقرر کرنے کا اختیار ہوگا۔

(۴) کمیشن کے کارہائے منصبی یہ ہوں گے:

(ا) دفعہ ۱۱ اور اس دفعہ کی ذیلی دفعہ (۱) میں متذکرہ مقصد کے حصول کے لئے پاکستان کے تعلیمی نظام اور ذرائع ابلاغ کا جائزہ لے اور اس بارے میں سفارشات پیش کرے۔

(ب) تعلیم اور ذرائع ابلاغ کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کے عمل کی نگرانی کرے اور عدم تعمیل کے معاملات وفاقی حکومت کے علم میں لائے۔

(۵) کمیشن کی سفارشات پر مشتمل ایک جامع رپورٹ اس کے تقرر کی تاریخ سے ایک سال کی مدت کے اندر وفاقی حکومت کو پیش کی جائے گی اور اس کے بعد کمیشن حسبِ ضرورت وقتاً فوقتاً اپنی رپورٹیں پیش کرتا رہے گا۔ البتہ سال میں کم از کم ایک رپورٹ پیش کرنا لازمی ہوگا۔ کمیشن کی رپورٹ حکومت کو موصول ہونے کے تین ماہ کے اندر پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں اور تمام صوبائی اسمبلیوں کے سامنے بحث کے لئے پیش کی جائے گی۔

(۶) کمیشن کو ہر لحاظ سے، جس طرح وہ مناسب تصور کرے، اپنی کاروائی کے انصرام اور اپنے طریقۂ کار کے انضباط کا اختیار ہوگا

(۷) جملہ انتظامی مقتدرات، ادارے اور مقامی حکام، کمیشن کی اعانت کریں گے۔

(۸) وزارتِ تعلیم حکومتِ پاکستان اس کمیشن سے متعلق انتظامی امور کی ذمہ دار ہوگی۔

۱۳۔ عمالِ حکومت کے لئے شریعت کی پابندی:

انتظامیہ، عدلیہ اور مقننہ کے تمام مسلمان ارکان کے لئے فرائضِ شریعت کی پابندی اور کبائر سے اجتناب لازم ہوگا۔

۱۴۔ قوانین کی تعبیر شریعت کی روشنی میں کی جائے گی:

اس قانون کی غرض کے لئے:

اوّل: قانون موضوعہ کی تشریح و تعبیر کرتے وقت۔ اگر ایک سے زیادہ تشریحات اور تعبیرات ممکن ہوں، تو عدالت کی طرف سے اس تشریح و تعبیر کو اختیار کیا جائے گا جو اسلامی

اصولوں اور فقہی قوائد وضوابط اور اصولِ ترجیح کے مطابق ہو اور

دوم: جبکہ دو یا دو سے زیادہ تشریحات وتعبیرات مساوی طور پر ممکن ہوں تو عدالت کی طرف سے اس تشریح وتعبیر کو اختیار کیا جائے گا جو اسلامی احکام اور دستور میں بیان کردہ حکمتِ عملی کے اصولوں کو فروغ دے۔

۱۵۔ بین الاقوامی مالی ذمّہ داریوں کا تسلسل:

اس قانون کے احکام یا اس کے تحت دیئے گئے کسی فیصلے کے باوجود اس قانون کے نفاذ سے پہلے کسی قومی ادارے اور بیرونی ایجنسی کے درمیان عائد کردہ مالی ذمّہ داریاں اور کیے گئے معاہدے، مؤثر، لازم اور قابلِ عمل رہیں گے۔

تشریح:۔ اس دفعہ میں "قومی ادارے" کے الفاظ میں وفاقی حکومت یا کوئی صوبائی حکومت کوئی قانونی کارپوریشن، کمپنی، ادارہ، ہیئت، تجارتی ادارہ اور پاکستان میں کوئی شخص شامل ہونگے اور "بیرونی ایجنسی" کے الفاظ میں کوئی بیرونی حکومت، کوئی بیرونی مالی ادارہ، بیرونی سرمایہ منڈی، بشمول بینک اور کوئی بھی قرضہ لینے والی بیرونی ایجنسی بشمول کسی شخص کے شامل ہوں گے۔

۱۶۔ موجودہ ذمّہ داریوں کی تکمیل:

اس قانون میں شامل کوئی امر یا اس کے تحت کوئی دیا گیا فیصلہ کسی عائد کردہ مالی ذمّہ داری کی بامضابطگی پر اثر انداز نہیں ہوگا بشمول ان ذمّہ داریوں کے جو وفاقی حکومت یا صوبائی حکومت یا کسی مالی یا قانونی کارپوریشن یا دیگر ادارے نے کسی دستاویزات کے تحت واجب کی ہوں یا اس کی طرف سے کی گئی ہوں، خواہ وہ معاہداتی ہوں یا بصورتِ دیگر ہوں یا ادائیگی کے وعدے کے تحت ہوں اور یہ تمام ذمّہ داریاں وعدے اور مالی پابندیاں قابلِ عمل لازم اور مؤثر رہیں گی۔

۱۷۔ قواعد:

متعلقہ حکومت سرکاری جریدے میں اعلان کے ذریعے اس قانون کی اغراض کی بجاآوری کے لئے وضع کر سکے گی۔

اربابِ ہوش کے لئے پیغامِ ہوش ہے!

سینٹ کے منظور کردہ شریعت بل کے مطابق، مسلّمہ اسلامی فرقوں کو حدودِ قانون کے اندر پوری پوری مذہبی آزادی حاصل ہوگی ـــــ "علمائے کرام" نے اس پر خوشی کے شادیانے بجائے ہیں مگر قرآن کہتا ہے:۔

ولا تکونوا من المشرکین. من الذین فرقوا دینھم و کانو شیعا ط کل حزب بما لدیھم فرحون (۳۰/۳۱)

(اے مسلمانو! دیکھنا) کہیں مشرک نہ بن جانا. یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور فرقے فرقے بن گئے (پھر اس کے بعد حالت یہ ہوگئی کہ) ہر گروہ اپنے اپنے مسلک (کو حق سمجھ کر اسی) میں مگن ہے۔

دوسری جگہ رسول اللہؐ نے فرمایا:۔

ان الذین فرقوا دینھم و کانو شیعا لست منھم فی شیٔ (۶/۱۶۰)

جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور فرقوں میں بٹ گئے تیرا ان سے کوئی سروکار نہیں

غور کیجئے! جس فرقہ بندی کو قرآن شرک قرار دیتا ہے ہمارے علمائے کرام اس پر خوشیاں منا رہے ہیں اور جن کے متعلق اللہ تعالےٰ اپنے رسولؐ سے کہتا ہے کہ ایسا کرنے والوں سے آپ کا کوئی تعلق نہیں. وہ آج سنتِ رسول اللہؐ کے سب سے بڑے محافظ بن رہے ہیں. کوئی ہے جو ان سے پوچھے کہ تم شریعت کی بنیاد توحید پر رکھنا چاہتے ہو یا شرک پر؟

مولوی صاحبان کا ارشاد ہے کہ ـــــ امت کا اختلاف رحمت ہے ـــــ اور اسے (معاذ اللہ) رسولِ خدا کا ارشاد بتاتے ہیں. حالانکہ اللہ تعالےٰ کہتا ہے کہ اختلاف خدا کا عذاب ہے۔

ولا تکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعد ما جاءھم البینت ط واولئک لھم عذاب عظیم (۳/۱۰۵)

دیکھو ان کی مانند نہ ہو جانا جنھوں نے فرقے بنا لئے اور (کتاب اللہ کی) روشن دلیلیں آچکنے کے بعد اختلاف کرنے لگے. یقین کرو یہی لوگ ہیں جن کے لئے سخت عذاب ہے

سوچئے! کہ یہ لوگ جو خود عذاب میں مبتلا ہیں دوسروں کو نجات کی راہ کیا بتائیں گے؟

ہمارے علمائے کرام کا مطالبہ ہے کہ یہ ہم سے پوچھو کہ فلاں معاملہ شریعت کے مطابق ہے یا نہیں. اور اللہ تعالےٰ اپنے رسولؐ سے کہتا ہے کہ:۔ وشاورھم فی الامر (۳/۱۵۹) "معاملات میں ان سب سے مشورہ کیا کرو" یعنی اللہ اپنے رسولؐ تک سے یہ کہتا ہے کہ معاملات میں امت سے مشورہ کیا کرو اور ہمارے علمائے کرام امت سے کہتے ہیں کہ تم ہم سے پوچھا کرو جو کچھ ہم کہیں اس کے مطابق فیصلے کیا کرو! یعنی یہ حضرات اپنا مرتبہ (معاذ اللہ) رسول اللہؐ سے بھی اونچا

اطاعتِ رسولؐ

ایک اہم سوال جو گزشتہ تیئس سال سے جواب طلب ہے

قارئینِ طلوعِ اسلام میں سے ایک علم دوست بزرگ نے ایک ایسا سوال پوچھا ہے جو اربابِ تحقیق کو دعوتِ فکر و تدبر دیتا ہے۔ ہم اسی مقصد کے پیشِ نظر اسے درج ذیل کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے:-

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اسلام میں اللہ کی اطاعت اور رسول کی اطاعت، دو مستقل بالذات الگ الگ اطاعتیں ہیں۔ اللہ کی اطاعت قرآن کریم کی رُو سے کی جاتی ہے اور رسول کی اطاعت احادیث کی رُو سے۔

اطاعتِ رسول کے سلسلہ میں عام طور پر دو گروہ سامنے آتے ہیں۔ ایک کا عقیدہ یہ ہے کہ حضورؐ نے منصبِ نبوت پر فائز ہونے کے بعد اپنی حیاتِ ارضی کے آخری سانس تک جو کچھ فرمایا وہ سب خدا کی طرف سے وحی تھا۔ دوسرے گروہ کا عقیدہ ہے کہ حضورؐ نے جو کچھ بہ حیثیت رسول فرمایا وہ وحی پر مبنی تھا۔ جو کچھ بشری حیثیت سے فرمایا، وہ وحی نہیں تھا۔ حضورؐ کی اطاعت اوّل الذکر حیثیت سے ہے۔

ظاہر ہے کہ ان دونوں گروہوں میں یہ چیز قدرِ مشترک ہے کہ جن امور میں حضورؐ کی اطاعت، اُمت پر ہمیشہ کے لئے لازم ہے۔ وہ امور خدا کی طرف سے بذریعہ وحی نازل ہوئے تھے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وحی کا ایک حصہ جسے وحی متلو کہا جاتا ہے۔ (قرآن کریم کے اندر ہے اور دوسرا حصہ (جسے وحی غیر متلو کہا جاتا ہے۔ (قرآن کریم کے باہر، احادیث میں ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر قرآن اور حدیث دونوں منجانب اللہ وحی ہیں تو ان کی اطاعت۔ اللہ کی اطاعت ہوگی۔ رسول کی اطاعت نہیں ہوگی۔ مثلاً اللہ تعالےٰ نے بذریعہ وحی اقامتِ صلوٰۃ کا حکم دیا۔ (یہ حکم قرآن میں درج ہوگیا) پھر اللہ تعالےٰ نے بذریعہ وحی اقامتِ صلوٰۃ کا طریقہ بتایا۔ (یہ وحی حدیث میں آگئی) جب دونوں حکم خدا کی طرف سے ملے، تو ان کی اطاعت، خدا کی اطاعت ہوئی۔ اس صورت میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسی بات باقی رہ جاتی ہے جسے رسولؐ کی اطاعت کہا جائے؟ یہ بات تو سمجھ

میں نہیں آتی کہ منجانب اللہ وحی کے ایک حصّہ کی اطاعت خدا کی اطاعت کہلائے اور اسی خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی وحی کے دوسرے حصّے کی اطاعت، رسول کی اطاعت کہلائے۔ وحی متلو ہو یا غیر متلو۔ جلی ہو یا خفی۔ قرآن میں ہو یا حدیث میں۔ وہ بہر حال خدا کی طرف سے تھی۔ اس لئے اس کی اطاعت، خدا کے احکام کی اطاعت ہوگی، رسول کی اطاعت نہیں ہوگی۔ اگر کہا جائے کہ ان احکام کی اطاعت، رسول کی اطاعت اس لئے کہلائے گی کہ امّت انہیں رسول اللہؐ کی زبان سے سنتی تھی۔ اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ پھر خدا کی اطاعت کیسے کہا جائے گا؟ کیونکہ امّت قرآن کریم کو بھی رسول اللہؐ ہی کی زبانِ مبارک سے سنتی تھی۔

میں شکر گزار ہوں گا اگر آپ میری اس الجھن کو دُور فرما دیں گے!

طلوعِ اسلام

یہ ہے ان کا سوال ـــــ وحی کے متعلق ہمارا مسلک قارئین کو معلوم ہے۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ خدا کی طرف سے جس قدر وحی حضورؐ پر نازل ہوئی تھی وہ سب کی سب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ اس لئے ہم اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ محترم مستفسر کی اس الجھن کو دُور کر سکیں۔ اگر کوئی صاحب، جو قرآن کریم سے باہر وحی منجانب اللہ کے قائل ہوں۔ اس باب میں کچھ تحریر فرمائیں تو طلوعِ اسلام اسے بخوشی شائع کرے گا، بشرطیکہ وہ علم و تحقیق پر مبنی ہو۔ محض جذباتی نہ ہو۔ اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ نقطہ زیرِ بحث یہ نہیں کہ وحی کی دو قسمیں ہو سکتی ہیں یا نہیں۔ سوال دریافت طلب یہ ہے کہ اگر قرآن اور حدیث دونوں وحی منجانب اللہ ہیں، تو ان میں سے ایک کی اطاعت، اللہ کی اطاعت، اور دوسری کی اطاعت، رسول کی اطاعت کس طرح کہلائے گی؟

نوٹ:۔

ادارہ طلوعِ اسلام کے دفتر پہنچنے کے لئے لاہور کے کسی بھی مقام سے دیگن آپ کو گلبرگ کی مین مارکیٹ پہنچا دے گی۔ ادارہ کا دفتر ۲۵۔بی گلبرگ ۲، مین مارکیٹ سے الیف سی کالج جانے والی سڑک پر پانی کی سربلند ٹینکی کے سامنے مین مارکیٹ سے ۳۰۰۔ میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔

ثواب

انسان اپنا مفہوم الفاظ کے ذریعہ بیان کرتا ہے، اسی لئے اسے حیوانِ ناطق کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ رفتہ رفتہ الفاظ باقی رہ جاتے ہیں اور جس مفہوم کے ادا کرنے کے لئے وہ وضع ہوئے تھے وہ مفہوم گم ہو جاتا ہے۔ بظاہر یہ چیز کچھ عجیب سی نظر آئے گی کہ الفاظ باقی ہوں اور ان کا مفہوم گم ہو چکا ہو۔ لیکن یہ ایک ایسی حقیقت ہے، جو بہ ادنیٰ تعمق اُبھر کر سامنے آجاتی ہے۔ متعدد الفاظ ہیں جنہیں ہم صبح سے شام تک بلا تکلف استعمال کئے جاتے ہیں لیکن کبھی نہیں سوچتے کہ ان کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ مذہبی دوائرِ حیات میں اس قسم کے الفاظ کی بڑی کثرت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ مذہب[1] کو زندگی کے عملی مسائل سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ اس کے مباحث نظری (THEORETICAL) ہوتے ہیں اور نظری مباحث میں اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی کہ یہ سوچا جائے کہ جو الفاظ ہم استعمال کرتے ہیں ان کا مفہوم کیا ہے

الفاظ بلا مفہوم

حقیقت یہ ہے کہ "مذہب" چونکہ انسان کے دورِ سحر (MAGIC AGE) کی یادگار ہے۔ اس لئے اس میں سارا زور الفاظ پر دیا جاتا ہے۔ ان کے مفہوم سے کچھ مطلب نہیں ہوتا۔ سحر کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ الفاظ (بلا مفہوم) کے اُلٹ پھیر اور اعادہ سے نتیجہ پیدا ہو۔ تعویذوں کے الفاظ کو دیکھئے، عجیب معملات کا مجموعہ دکھائی دیں گے۔ لیکن تعویذ لکھنے والے ان کی پابندی پر اس قدر زور دیں گے کہ اگر ایک حرف میں بھی ردّ و بدل ہو جائے تو وہ سمجھ لیں گے کہ اب نتیجہ مرتب نہیں ہو سکتا۔ "الفاظ بلا مفہوم" اور "اعمال بلا نتیجہ" یہ ہے "مذہب" کی صحیح تعریف۔

اسلام "مذہب" کے خلاف ایک صدائے احتجاج تھا۔ وہ مذہب کے بجائے دین لے کر آیا تھا جسے آج کی اصطلاح میں آئینی نظامِ زندگی کہا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ نظامِ زندگی، نظری مسائل سے نہیں بلکہ زندگی کے

---

[1] مذہب سے مراد انسانوں کا خود ساختہ "مذہب" ہے۔ خدا کی طرف سے دین ملتا ہے۔ اس لئے اسلام مذہب نہیں بلکہ دین ہے۔

علمی مسائل سے بحث کرے گا۔ اور جب اس بحث کا دائرہ علمی مسائلِ حیات پر مشتمل ہوگا تو اس کے الفاظ واضح اور بیّن مفہوم کے پیکر ہوں گے۔ اس میں "لفظ بلا معنی" کا تصور بھی نہیں کیا جا سکے گا۔ قانون اور آئین کی دنیا میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہوتا جس کا مفہوم ٹھیک ٹھیک متعیّن نہ کر دیا گیا ہو۔ اگر کسی لفظ کی تعریف (DEFINITION) میں ذرا فرق ہو جائے تو اس سے پورے کا پورا قانون بدل جاتا ہے۔ اسی لئے قانون کی کتابوں میں ہر لفظ کی تعریف متعیّن کر دی جاتی ہے۔ مثلاً چوری جُرم ہے۔ قانون کی کتاب میں پہلے یہ بتایا جائے گا کہ چوری کہتے کسے ہیں۔ اس لفظ کا مفہوم کیا ہے۔ اس متعیّنہ مفہوم کے مطابق یہ فیصلہ ہوگا کہ فلاں عمل چوری کہلا سکتا ہے یا نہیں۔ وقس علیٰ ہذا۔

متعیّن مفہوم

اسلام جب ایک آئینی اور قانونی نظامِ زندگی اپنے ساتھ لایا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے ہر لفظ اور ہر اصطلاح کا مفہوم متعیّن ہوگا۔ بلا تعیّن مفہوم نہ قانون، قانون رہ سکتا ہے، نہ آئین، آئین۔ اسلام کا ضابطہ آئین قرآن ہے اور قرآن کا خاصہ ہے کہ وہ اپنے الفاظ کا مفہوم خود متعیّن کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ وہ کتاب آئین ہے "مذہبی منتروں" کی کتاب نہیں۔ لیکن جب قرآن کا دین مذہب میں تبدیل[1] ہو گیا تو جس طرح ہر مذہب کی حالت ہے، اس کے الفاظ تو باقی رہ گئے۔ لیکن ان الفاظ کا مفہوم نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اب حالت یہ ہے کہ ہم صبح سے شام تک ان الفاظ کو دہراتے ہیں، لیکن کبھی نہیں سوچتے کہ ان الفاظ کا مفہوم کیا ہے؟ انہی الفاظ میں ایک لفظ "ثواب" بھی ہے۔ مذہب پرست طبقہ میں دیکھئے۔ بات بات میں اس لفظ کو دہرایا جائے گا۔ یہ کرنے سے اتنا ثواب ہوتا ہے۔ وہ کرنے سے اتنا ثواب ملتا ہے جس بات کے متعلق پوچھئے کہ ایسا کرنے سے کیا ہوگا تو اس کا جواب یہی ملے گا کہ اس سے ثواب ہوگا۔ لیکن اگر آپ پوچھ بیٹھیں کہ جناب! ثواب ہوتا کیا ہے، تو آپ حیران رہ جائیں گے اس کا کوئی معقول جواب آپ کو نہیں ملے گا آپ کو یہ بات بظاہر تعجب انگیز ہی دکھائی دے گی (اور ہر وہ بات جس پر پہلے پہل غور کرنے کی دعوت دی جائے تعجب انگیز نظر آیا کرتی ہے) لیکن جو کچھ ہم نے کہا ہے وہ امرِ واقعہ ہے۔ آپ دُور نہ جائیے۔ خود اپنے آپ سے سوال کر کے دیکھئے۔ آپ نے بھی تو اس لفظ کو متعدد بار بولا ہوگا۔ ذرا سوچئے تو سہی کہ آپ کے ذہن میں اس کا مفہوم کیا ہے۔ آپ کو اپنے ذہن سے زیادہ سے زیادہ یہ جواب ملے گا کہ "ثواب" کوئی ایسی چیز ہے جس سے قیامت میں جہنم کے عذاب سے نجات ملے گی۔ یعنی یہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کا کوئی اثر آپ کی ذات پر مرتب ہوتا ہو، یا جس کا تعلق آپ کی اس زندگی سے ہو۔ اس کا تعلق آخرت کی زندگی سے ہے۔

ثواب کیا ہے؟

---

[1] اس کی تفصیل کے لئے دیکھئے "اسبابِ زوالِ اُمّت"

اور وہاں کے متعلق کہا نہیں جاسکتا کہ کیا ہوگا اور کیسے ہوگا۔ یہ ہے "ثواب" کا وہ مفہوم جو آپ کے ذہن میں آئے گا۔ یا آپ کو وہ شخص بتائے گا جس سے آپ اس کا مفہوم پوچھیں گے۔

غور کیجئے کہ یہ لفظ ایسا ہے جس کا استعمال بات بات میں ہوتا ہے لیکن اس کا مفہوم ایسا مبہم بتایا جاتا ہے جس سے کچھ پتے ہی نہیں پڑتا کہ بات کیا ہوئی۔ آپ سوچئے کہ اس کا نتیجہ کیا ہے؟ مذہب پرست طبقہ ہمیشہ شکایت کرتا رہتا ہے کہ مسلمان اسلامی احکام کی پرواہ نہیں کرتے۔ ان کی زندگی مذہبی نہیں رہی۔ وہ اوامر و نواہی کے پابند نہیں رہے۔ یہ لوگ شکایت تو مسلسل کرتے رہتے ہیں لیکن کبھی اتنا سوچنے کی زحمت گوارا نہیں فرماتے کہ بالآخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ آپ ایک بچے سے تو اس طرح کام کرا سکتے ہیں کہ یہ کرو، وہ نہ کرو۔ بغیر بتائے ہوئے کہ ایسا کرنے سے کیا ہوگا، اور ایسا نہ کرنے سے کیا۔ مذہب کی تاکید یہ ہوتی ہے کہ ان معاملات میں عقل کو کوئی دخل نہیں، اس لئے تم "کیوں" نہ پوچھو۔ جو کچھ کہا جاتا ہے چپکے سے کئے جاؤ۔ انسانی ذہن اپنے عہدِ طفولیت میں تو اس طریقِ کار پر عمل پیرا ہو سکتا تھا لیکن جب وہ "کیوں" کے مقام تک پہنچ جائے تو پھر مجرد حکم اس کے لئے محرکِ عمل نہیں ہو سکتا۔ وہ حکم کی لِم بھی سمجھنا چاہتا ہے۔ چونکہ قرآن مذہب نہیں بلکہ دین لایا تھا، اس لئے اس نے ذہنِ انسانی کے اس تقاضے کو نظر انداز نہیں کیا، بلکہ کتاب (قانون یا حکم) کے ساتھ حکمت (اس کی لِم "کیوں") بھی بتا دی اور ہر مقام پر واضح کر دیا کہ ایسا کرنے سے کیا ہوگا۔ اور ایسا نہ کرنے سے کیا۔ اس نے اپنی دعوت کی بنیاد ہی بصیرت پر رکھی۔ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ صاحبانِ عقل و بصیرت خود دیکھ سکتے ہیں کہ اس نظامِ حیات کے نتائج کیا ہوں گے۔ اس نے کھلے کھلے طور پر کہہ دیا کہ بدترین خلائق (شرالدواب) وہ انسان ہیں جو عقل و بصیرت سے کام نہیں لیتے۔ دنیا کا کوئی نظام ہو، اس کی جاذبیت کا راز اس کے نتائج میں مضمر ہوتا ہے۔ اور نتائج اس ٹھوس حقیقت کا نام ہے جو بلا حجاب و نقاب سامنے آجائے۔ مبہم الفاظ اور غیر متعین مفہوم کبھی نتائج کی جگہ نہیں لے سکتے۔ یہ ہے اصل وجہ اس امر کی کہ مسلمان "مذہبی احکام" کی پابندی نہیں کرتے۔ مبہم الفاظ سوچنے والے ذہن کے لئے کبھی وجہِ کشش نہیں ہو سکتے۔ ان سے صرف وہی طبقہ متمسک رہ سکتا ہے جس کا ذہن ہنوز "عہدِ طفولیت" میں ہو۔ سوچنے والا ذہن، کتاب (حکم) کے ساتھ اس کی حکمت (لِم) کا بھی تقاضا کرتا ہے، اور حکم کی لِم اس کے نتیجہ ہی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ دین (نظامِ زندگی) نتائج پیش کرتا ہے اور یہی نتائج اس کی کشش کا باعث ہوتے ہیں۔

عمل کیوں نہیں ہوتا

ثواب کے معنی

اس تمہید کے بعد لفظ ثواب پر غور کیجئے۔ ثاب کے لغوی معنی ہیں کسی چیز کا لوٹ کر آجانا۔ کسی حوض کا اس طرح لبالب بھرے رہنا کہ جتنا پانی اس میں سے نکلے اتنا ہی

اس میں واپس آتا ہے۔ استشاب کہتے ہیں۔ (RESTORATION) کہ

آپ کوئی کام کیجئے اس میں کچھ نہ کچھ صرف ہوگا۔ مال وقت توانائی (ENERGY) ذہنی ہو یا جسمانی۔ اگر اس کام کا نتیجہ، اس صرف شدہ توانائی کو واپس لے آتا ہے، تو وہ نتیجہ اس کا ثواب ہوگا۔ ثاب جسمے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جسم سے جس قدر توانائی زائل ہو جائے ——— وہ پھر واپس آجائے اور اس طرح جسم تنومند اور توانا رہے۔ آپ صبح سے شام تک کوئی کام کرتے ہیں جس کے معاوضہ میں آپ کو کچھ روپیہ ملتا ہے لیکن اس کام کے کرنے میں آپ کی توانائی صرف ہوتی ہے، اس کے لئے آپ اچھی غذا کھاتے ہیں جس سے آپکی صرف شدہ توانائی واپس مل جاتی ہے۔ اس طرح آپ کے اس طریق کار کی رُو سے آپ کی توانائی بھی برقرار رہتی ہے اور جو کچھ آپ کماتے ہیں وہ آپ کا منافع ہوتا ہے۔ اوّل الذکر (توانائی کے واپس آجانے کو) ثواب کہتے ہیں۔ اور ثانی الذکر (حاصلِ محنت) کو فوز (ACHIEVEMENT) یا مثلاً آپ سیر کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس میں آپ کی کچھ توانائی (ENERGY) صرف ہوتی ہے۔ لیکن وہ سیر آپ کی صحت کے لئے مفید ہے۔ اس لئے کہ وہ صرف شدہ توانائی کو واپس لاتی ہے اور آپ کی صحت کو بھی درست کرتی ہے جس سے آپ کی نشوونما ہوتی ہے۔ یہ سیر کا ثواب اور فوز ہے۔ اسلام کے نظام (الدین) میں ہر فرد اپنے مفوضہ فرائض کو سرانجام دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں ان افراد کا وقت۔ مال۔ توانائی۔ ذہنی اور قلبی قوتیں صرف ہوتی ہیں۔ اس نظام کے اجتماعی نتائج ان صرف شدہ قوتوں اور قدروں کو بھی واپس دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ارتقائے انسانیت کا وہ مقصدِ کلی بھی پورا ہوتا (اور آگے بڑھتا) رہتا ہے جس سے انسان کارگہِ عالم کے تخلیقی پروگرام میں خدا کا رفیق بنتا ہے۔ اس قرآنی نظامِ زندگی کے نتائج کو "ثواب اللہ" کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جہاں فرمایا کہ:

ثواب اللہ خیر لمن اٰمن وعمل صالحًا (۲۸/۸۰)

"جس نے اس نظام کی حقانیت کو تسلیم کیا اور اس کے بعد ایسے کام کئے جو انسانی معاشرہ میں ہمواری کا موجب ہوں تو ان کے لئے اس نظام کے نتائج بڑے خوشگوار ہونگے"

لہٰذا "ثواب اللہ" کے معنی ہیں اس نظامِ زندگی کے جیتے جاگتے نتائج جو قرآنی اصولوں کے مطابق قائم کیا جائے۔ دنیا کے عام نظامہائے معاشرت (جن کی اساس مستقل اقدار پر نہیں ہوتی) طبعی قوانین کے مطابق اپنے اپنے نتائج مرتب کرتے ہیں۔ جو شخص اچھی خوراک کھائے گا تندرست و توانا رہے گا۔ لیکن ان نتائج کا تعلق انسان کے پیش پا افتادہ مفاد تک محدود ہوتا ہے۔ وہ زندگی کی جُوئے رواں کے ساتھ ساتھ نہیں چلتے۔

قرینِ مفاد انہیں قرآن ثواب الدنیا کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ ان لوگوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ ذرا سوچو! یہ تمہاری کس قدر بھول ہے کہ تم اتنی تگ و تاز بھی کرتے ہو۔ لیکن اس کے بعد صرف

قریبی مفاد پر اکتفا کر کے بیٹھ جاتے ہو۔ اگر تم اپنے معاشرے کو مستقل اقدار (وحی کے خطوط پر متشکل کر لو تو اسی تگ و دو سے یہ قریبی مفاد بھی حاصل ہو جائیں اور ان کا سلسلہ آگے بھی بڑھتا جائے۔ ان نتائج کا نام ثواب الدنیا والاخرۃ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ من کان یرید ثواب الدنیا۔ جو لوگ صرف قریبی مفاد تک ہی رک کر رہ جاتے ہیں۔ ان سے کہو کہ فعند اللہ ثواب الدنیا والاخرۃ (۴/۱۳۴) کہ نظامِ خداوندی میں قریب اور بعید دونوں کے مفاد حاصل ہوتے ہیں۔ سو بتاؤ کہ یہ نظام اچھا ہے یا تمہارا نظام؟ ظاہر ہے کہ نظام وہی اچھا ہوگا جس کے نتائج کا سلسلہ حیاتِ انسانی کے ساتھ ساتھ مسلسل قائم رہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے کہا ہے کہ اپنے سامنے ہمیشہ یہ آرزو رکھو ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاخرۃ حسنۃ۔ یعنی دنیا اور آخرت دونوں میں خوشگوار اور حسین زندگی۔ قرآن کی رُو سے نظامِ زندگی کے تین انداز ہو سکتے ہیں۔

مستقبل کی درخشندگی

ایک وہ نظام جس کے خوشگوار نتائج انسانی زندگی کے ساتھ ساتھ دواں دواں چلتے ہیں۔ اور اس طرح یہاں سے وہاں تک شاہراہِ حیات شگفتہ و شاداب رہے۔ یہ ہے الدین۔ یہ وہ نظام جس میں ثواب الدنیا والاخرۃ دونوں حاصل ہوتے ہیں۔

دوسرا نظام وہ ہے جسے دنیا کی قومیں اپنی مصلحت کوشیوں کے ماتحت وضع کرتی ہیں اور اپنی نگاہوں کو صرف اسی زندگی تک محدود رکھتی ہیں۔ اس نظامِ زندگی کے نتائج اسی دنیا تک محدود رہتے ہیں۔ وما لہ فی الاخرۃ من خلاق۔ اس کے بعد کی زندگی میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ یہ خالص دنیا داری کی زندگی ہے۔

نہ یہ نہ وہ

تیسرا نظام وہ ہے جس میں نہ اس زندگی کی خوشگواریاں حاصل ہوتی ہیں نہ اس کے بعد کی زندگی کی۔ یہ ہے "مذہب کی زندگی"۔ اس زندگی میں انسان اپنے آپ کو اس دھوکے میں رکھتا ہے کہ اگر ہماری موجودہ زندگی ذلت و خواری کی زندگی ہے تو کوئی بات نہیں۔ یہ زندگی چند روزہ ہے۔ اس کے بعد حیاتِ ابدی کی ہمیشہ رہنے والی خوشگواریوں کے ہم ہی مالک ہیں۔ لیکن قرآن کی رُو سے یہ بہت بڑا دھوکا ہے۔ نفس کا فریب ہے۔ وہ کہتا ہے کہ هل ننبئکم بالاخسرین اعمالاً۔ کیا تمہیں بتائیں کہ وہ لوگ کون ہیں جن کے کاموں کا نتیجہ خسارہ ہی خسارہ ہے۔ الذین ضل سعیھم فی الحیوۃ الدنیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی کوششیں دنیاوی زندگی میں غلط راہوں پر پڑ جاتی ہیں۔ وھم یحسبون انھم یحسنون صنعا۔ لیکن وہ بزعمِ خویش یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے نیک کام کر رہے ہیں۔ اولئک الذین کفروا بایات ربھم ولقائہ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو درحقیقت قانونِ خداوندی کا عملی انکار کرتے ہیں۔ اس طرح کہ حقائق کا آمنا سامنا کرنے (TO FACE REALITIES) کی بجائے وہ ان سے گریز کی راہیں ڈھونڈ لیتے ہیں۔ فحبطت اعمالھم ان کے کام بظاہر بڑے خوش آئند دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کا نتیجہ

کچھ بھی نہیں ہوتا۔ فلا نقیم لھم یوم القیامۃ وزنا (۱۸/۱۰۴-۱۰۲) یہ اعمال ایسے بے نتیجہ ہوتے ہیں کہ ظہورِ نتائج کے سلسلے میں ان کا وزن تک معلوم کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ بالکل بے وزن ہوتے ہیں۔ مذہب پرست طبقہ اپنے آپ کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیتا ہے کہ اگر ہماری آج کی دنیا خوشگوار نہیں تو نہ سہی آخرت کی نعمتیں تو ہمارے ہی لئے ہیں لیکن یہی ان کی بھول ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ من کان فی ھذہ اعمیٰ فھو فی الاخرۃ اعمیٰ۔ اس دنیا کا اندھا اُس دنیا میں بھی اندھا ہی رہے گا۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ آج کی دنیا ذلیل اور خوار ہو اور کل کی دنیا میں ساری سرفرازیاں انہی کے حصے میں آجائیں۔ لہٰذا (۱) ــــ اسلام کے نظامِ حیات میں امروز اور فردا دونوں خوشگوار ہوتے ہیں۔ (۲) ــــ عام دنیاوی نظام میں صرف امروز خوشگوار ہوتا ہے۔ (۳) ــــ اور انسانوں کے خود ساختہ "مذہب" کی دنیا میں نہ آج خوشگوار ہوتا ہے نہ کل۔ ایک مقدس دھوکا ہوتا ہے اور بس۔ وھم یحسبون انھم یحسنون صنعا۔ مسلمان صدیوں سے اس مقدس دھوکے میں مبتلا ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کی رُو سے ثواب کے معنی کیا ہیں۔ یعنی اعمالِ حیات کے وہ زندہ اور مثبت نتائج جو محسوس شکل میں ہمارے سامنے آجائیں اور جس سے ہماری دنیاوی زندگی بھی خوشگوار ہو اور موت کے بعد کی زندگی بھی۔

جو اعمالِ حیات اپنے محسوس نتائج پیدا نہیں کرتے یاد رکھئے کہ ان کا کوئی ثواب نہیں ملتا۔ اب آپ اپنے لئے خود میزان قائم کر کے دیکھ لیجئے کہ آپ کے کون کون سے اعمال ایسے ہیں جن کا ثواب ہوتا ہے اور کون کون سے ایسے ہیں جن کا کوئی ثواب نہیں ہوتا

اے مسلماں! اپنے دِل سے پوچھ، مُلّا سے نہ پوچھ

(پرویزؒ صاحب کی شہرہ آفاق کتاب "سلسبیل" سے ماخوذ)

شریعت بل پر تبصروں کا سلسلہ اگلے ماہ بھی جاری رہے گا